ماہنامہ
پیام ادب

ادارۂ اشاعت اردو
عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن

ماهنامہ پیامِ اُردو

جلد (۱)

نمبر (۳)

ماہ نومبر ۱۹۴۳ء

مسئول مدیر

سید عبد الوہاب

ڈائرکٹر منیجنگ

چودھری اقبال سلیم گاہندری

ناشر

اِدارہ اشاعت اُردو

عابد روڈ - حیدرآباد دکن

چندہ سالانہ چھ روپیے

فی پرچہ آٹھ آنے

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

مندرجات

نظرات

ماہ نومبر کا پرچہ پریس کے حوالہ کیا جا رہا تھا کہ اُردو زبان کے مشہور مترجم مولوی عنایت اللہ دہلوی نے داعی اجل کو لبیک کہا مرحوم ایک خوش مزاج، فائدہ رساں اور عدیم المثال قدرت قلم رکھنے والے اَدیب تھے، اُن کے والد ماجد شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ دہلوی مصنف تاریخ ہندوستان بھی۔ اُردو زبان کے جلیل القدر مصنفین میں سے تھے، اور خود مرحوم نے بھی ہماری زبان کی اپنے قلم سے بڑی مدد کی خصوصاً انگریزی سے ترجمہ میں جو غیر معمولی کمال مرحوم کو حاصل تھا، شاید اُردو زبان کے کسی دوسرے مترجم کو حاصل نہ ہوگا۔

مولوی عنایت اللہ دہلوی ایک مدت تک حکومتِ ہند میں مترجم کی خدمت انجام دیتے رہے، اِس کے بعد جب جامعہ عثمانیہ کی داغ بیل پڑی اور دارالترجمہ قایم ہوا تو تھوڑے دنوں کے بعد مرحوم کو اس کی نظامت سپرد کی گئی۔ مرحوم کا کازمانہ دارالترجمہ میں خاص طور پر یادگار رہے گا۔ اُن کے زمانہ میں مشرقی و مغربی زبانوں سے علوم وفنون کی بہترین کتابیں ترجمہ ہو کر شایع ہوئیں۔

مرحوم اپنی طبیعت کے اِعتبار سے علم دوست، خوش مزاج اور بڑے نرم دِل آدمی تھے، خود صاحب علم تھے اور صاحبان علم کی قدر کرتے تھے۔ قدیم اقوام کی تاریخ سے خاص دلچسپی تھی، آخری زمانے میں بہت سے ایسے اَفسانے آپ نے ترجمہ کر کے شائع کرائے جن کا تعلق قدیم مصری یا یونانی اقوام سے ہے۔

اِدارۂ پیام اَدب مرحوم کی وفات کو اُردو زبان کا عظیم نقصان سمجھتے ہوئے، سارے اُردو بولنے اور اُردو لکھنے والوں کے ساتھ غم میں شریک ہے اور دست بدعا ہے کہ خدا مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ہماری زبان کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

اِرادہ تھا کہ نومبر کے پرچہ میں مقررہ ابواب کے ماتحت مضامین نظم ونثر کی تقسیم کر دی جائے اور پیام اَدب کی ترتیب کو خاص ندرت وافادیت کے مطابق بنا دیا جائے مگر ہمارے بعض قلمی معاونین کی رائے ہے کہ اِس قسم کی پابندی ارباب ذوق سے پوری طرح مشورہ کئے بغیر نہ ہو، اِس لئے اِس ارادہ کو جنوری تک کے لئے ملتوی کر دیا جائے۔

رسالہ "پیام اَدب" آپ کا اپنا رسالہ ہے، ہم آپ کی رائے کے بغیر کوئی تبدیلی کرنا نہیں چاہتے، ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ خود آپ اپنے رسالہ کو کیسا دیکھنا پسند کرتے ہیں، اِسی لئے ہم نے اکتوبر کے پرچہ میں آپ سے مشورہ طلب کیا تھا اور اَب پھر دوبارہ درخواست کرتے ہیں کہ رسالہ کو زیادہ مفید، زیادہ کارآمد، اور زیادہ دلچسپ بنانے کے سلسلہ میں آپ ہمیں کیا ہدایت دیتے ہیں۔ دسمبر کے پرچہ میں اِنشاء اللہ ہم اپنی مجوزہ ترتیب کا خاکہ پیش کریں گے جس کے ماتحت جنوری سے رسالہ کی ترتیب ہوا کرے گی کیا بہتر ہو کہ اس سے پہلے ہم آپ کے قیمتی مشورہ سے بہرہ اَندوز ہو سکیں۔

اِس ماہ کے مضامین میں جناب محمود محتسب صاحب کا ایک مختصر مضمون "اَدب اور سینما" پر ہے، موصوف کی رائے میں صنعت فلم سازی کو بند کر دینا تو بس کی بات نہیں مگر اس سے زبان پر جو بُرے اثرات مرتب ہو رہے ہیں اُس کی نگہداشت بلکہ اس کے دفعیہ کی کوشش ضروری ہے، اُس کے لئے موصوف نے سینما دیکھنے والوں سے اپیل کی ہے موصوف کی اس رائے سے کیسے اِختلاف ہوسکتا ہے کہ سیناؤں کی آمدنی کا بڑا حصہ ۴؍ اور ۶؍ والے درجہ میں تماشا دیکھنے والوں سے وصول ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اُن میں شاید ہی کوئی ہو جسے اُن برے اثرات کا احساس ہوسکے جو اُردو زبان پر فلموں میں استعمال کی جانے والی غیر فصیح اور پوچ زبان سے پڑ رہا ہے۔ اِس لئے یہ مسئلہ ایک نہایت اہم مسئلہ بن جاتا ہے۔ ہماری فلموں میں جو فنی کمزوریاں ہوتی ہیں، اس سے بحث نہیں لیکن اُن کی وجہ سے زبان میں ایسی دوراز فہم ترکیبیں، اور ایسے کریہہ الفاظ رواج پا رہے ہیں جن کے مقابلہ میں زیادہ بہتر اور زیادہ فصیح الفاظ ہمارے ہاں پہلے سے موجود ہیں۔ یقیناً اُردو زبان کے تمام ہی خواہوں کو اس سے اتفاق ہوگا کہ فلمی زبان کی اِصلاح کے لئے ایک وسیع پروگرام کے ساتھ جد وجہد کرنا اَب ضروری ہوگیا ہے ورنہ اور کچھ دنوں تک اگر ہم خاموش دیکھتے رہے تو شاید ان کی اصلاح امکان سے باہر ہو جائے گی۔

محترمہ بسم اللہ بیگم صاحبہ کا مضمون "مصارفِ غذا میں کفایت شعاری کے عملی طریقے" ایک بروقت اور مفید مضمون ہے۔ محترمہ کے مشوروں پر ہر گھر میں عمل ہونا چاہیئے۔ ہمارے ملک میں اِس وقت سب سے اہم مسئلہ غذا کا مسئلہ ہے اگرچہ یہ مسئلہ دنیا کے تمام ملکوں کے لئے اور ہر زمانہ میں اہم رہا ہے لیکن جنگ کی طوالت نے جو اثرات مرتب کئے ہیں ان میں اِنسان کی سب سے پہلی ضرورت یعنی غذا کی بہم آوری نازک ترین صورت اِختیار کر چکی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہر شخص اور ہر گھر اس کی طرف پوری طرح متوجہ ہو جائے۔

اِس ماہ کے دوسرے مضامین بھی حسب سابق بہترین ادباء کے بہترین مضامین ہیں، نظموں کا معیار ہمیشہ کی طرح نہایت بلند ہے۔ ہر نظم اور ہر غزل اپنی اپنی جگہ پر بہترین داد کی مستحق ہے

اِس ماہ بعض تنقیدی مضامین خاص طور پر شریک رسالہ کئے گئے ہیں، جن میں ڈاکٹر غلام جیلانی ایم۔اے پی۔ایچ۔ڈی کا مضمون "روحِ اقبال" پر توجہ خاص کا مستحق ہے۔ ہماری رائے میں یہ مضمون کسی قدر تشنہ ہے۔ چاہیئے تھا کہ خوبیاں اور خامیاں دونوں بغیر کسی رو رعایت کے واضح کر دی جاتیں۔ "جدید شاعری پر ایک نظر" حضرت صمد رضوی کا مضمون اپنی وسعت کے اِعتبار سے موصوف کی زیادہ فرصت کا طلبگار ہے۔ اگرچہ جو کچھ لکھا گیا ہے بہت خوب ہے لیکن جناب رضوی صاحب نے اگر یہ سلسلہ جاری نہ رکھا تو یقیناً اُن کا یہ ظلم ہوگا۔

(اِدارہ)

محمود محتسب

اَدب اور سینما

سینما اپنی تمام تر برائیوں کے باوجود اب شہریت کے لوازم میں داخل ہوچکا ہے، یہ بلا شہروں سے آگے بڑھ کر قصبات اور دیہاتوں میں بھی پہنچ رہی ہے۔ طرح طرح کے سفری سینما بن کر تیار رہیں، اور جا بجا مختلف اقسام کے فلم دکھاتے پھرتے ہیں، اُن کے جو اثرات مرتب ہوتے ہیں، اب اُن سے قطع نظر نہیں کیا جا سکتا۔ ضرورت ہے کہ اُن کے نقصانات سے بچنے کی تدابیر پر غور کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہوسکے اُن نقصانات کو کم کیا جائے۔

بعض ممالک میں کم عمر بچوں کے لئے سینما بینی کو ممنوع قرار دیا جاچکا ہے، بعض جگہ فلم ساز کمپنیوں پر دوسری پابندیاں عاید کی گئی ہیں، اور سنسر تو تقریباً ہر جگہ قایم ہے۔ لیکن ایک ملک ہندوستان ہے جہاں سنسر کا کام صرف سرکاری نقطۂ نظر سے فلموں کو دیکھنا ہے، عوام کے فائدہ و نقصان سے عموماً غور کیا ہی نہیں جاتا۔

اِن حالات میں ہمیں چاہیئے کہ ہم خود اپنا کام کریں، اور اچھی طرح غور و فکر کے بعد اس کے نقصانات کی مقدار امکانی حد تک کم کرنے کی تدابیر نکالیں۔

یہ ایک بین حقیقت ہے کہ اس زمانہ کا کوئی افلاطون بھی فلم کا کوئی خاص فائدہ بجز تفریح اور وہ بھی تکدر آمیز، غیر صحتی، اور سفر تفریح کے کچھ نہیں بتا سکتا، لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ صنعت فلم سازی کو یکدم بند کر دینا سوائے ایک نہایت جری اور اعلیٰ درجہ کی منظم حکومت کے کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں۔ لوگ اِس قدر تنوع پسند اور رنگ و شکل کے دیوانے ہیں کہ نقصانات کا یقین رکھنے کے باوجود، اور یہ اچھی طرح جاننے کے باوجود کہ وہ کسی فلم کو دیکھ کر اپنے لئے کچھ حاصل نہیں کرتے بلکہ ڈھائی گھنٹہ انتہائی غیر صحت بخش فضا میں قید رہنے، کچھ پیسے جیب سے دینے، اور آنکھوں کو تھکا دینے والی برقی کرنوں پر ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہنے سے اپنی صحت، اپنی دولت اور اپنے وقت کا خون کر رہے ہیں، ایک جماعت ہے کہ سینما کی طرف اس طرح دوڑ رہی ہیں جیسے بنگال کے فاقہ کش لنگر خانوں کی طرف۔

اِس کے بعد سینما ہالوں کے دروازوں کا وہ بے پناہ ہجوم، ٹکٹ حاصل کرنے کی وہ کشمکش جس میں اکثر شیروانیوں کے پرزے اُڑ جاتے ہیں، اور جگہ حاصل کرنے کی وہ تگ و دو جس میں ٹھوکریں، دھکے، اور ٹوپیوں کا "رقص فضائی" سب کچھ شامل ہوتا ہے، آنکھ والوں کو ایسی دعوت نظارہ ہے کہ اگر کوئی دور سے کھڑا ہو کر ان دلچسپ مناظر کو دیکھے تو سینما سے زیادہ سامان تفریح پائے گا۔

یہ سب کچھ ہے اور عیدگاہوں کے بھیڑ اور مندروں کے انبوہ سے گھبرا اُٹھنے والے نازک مزاج مسلمان و ہندو اپنی رضا بلکہ تمنا کے ساتھ جیب سے روپے خرچ کرتے ہیں اور یہ ساری مصیبتیں جھیلتے، دکھ اٹھاتے اور بے عزتی

برداشت کرتے ہیں۔ ہمارے امراء بھی جاتے ہیں، غربا بھی، بوڑھے بچے جوان سب ہی اس میں مبتلا ہیں، مرد بھی پہنچتے ہیں اور عورتیں بھی، رکشا اور جھٹکے چلانے والوں سے لے کر ڈاج اور رولز رائیس کاروں کے مالکان ذوی الاحتشام تک اس کے شیدا ہیں۔ اس لئے اس کے خلاف کون کہے، اور کس میں سننے کی برداشت ہے؟ یہ کام نوجوانوں کا ہے کہ وہ بڑھیں جرات کریں اور بوڑھوں کو اپنی قوتِ عمل سے شرمندہ کردیں، ثابت کردیں کہ "ادب برائے ادب" اور "آرٹ برائے آرٹ" نہیں بلکہ "ہر دو برائے زندگی" کا اصول کارفرما ہونا چاہیئے اور جس آرٹ کے نقصانات انسانی زندگی میں اس کے فوائد سے زیادہ ہوں ایسے مضر، خطرناک اور نامعقول آرٹ کو مٹ جانا چاہیئے، اگر سخت جانی سے یہ خود نہیں مٹتا تو ہوشمند نئی نسل اسے اپنی قوت سے مٹا دے گی؛

بہرحال ہمیں سینما بینی اور فلم سازی کے خلاف اس وقت کچھ کہنا مقصود نہیں، اور نہ یہ بتانا مقصود ہے کہ فلم سازی کی ترقی کے ساتھ ساتھ جرائم کس طرح بڑھ رہے ہیں بلکہ چند الفاظ میں سینما کے ان مضر اثرات کا ذکر مقصود ہے جو زبان پر پڑ رہے ہیں۔

انسان فطرتاً نقال ہے، جو دیکھتا ہے، اس کی نقل اتارتا ہے اور جو سنتا ہے اسے دہراتا ہے، یہی طریقہ ہماری ابتدائی زندگیوں میں ہمیں بولنا سکھاتا ہے، اور اسی سے ہم نشست و برخاست کے طریقے، اور کھانے پہننے کا ڈھنگ سیکھتے ہیں، اس لئے کوئی تعجب نہیں اگر آپ کو گلیوں میں گھومنے والے آوارہ گزار لڑکے اور جاہل مزدور پیشہ لوگ سینما کے گیت اور اس کے مکالمے دہراتے ہوئے ملیں؛

ان گیتوں اور ان مکالموں پر ذرا غور فرمائیے تو صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ بالارادہ ہماری زبانوں پر نامانوس الفاظ اور عجیب و غریب جملے جاری کرائے جارہے ہیں، کون کہہ سکتا ہے کہ "دل"، "قلب"، اور "جی" کی بجائے لفظ "ہردے" اردو بولنے والوں کے ہاں زیادہ رائج ہے، مسلم غیر مسلم، امیر غریب، اور تعلیم یافتہ، غیر تعلیم یافتہ کون سے گھرانے میں یہ لفظ زیادہ چلتا ہے۔ اسی طرح کہاں لفظ "معاف" کی بجائے "شما" زیادہ مروج ہے۔ یہ اور اس طرح کے ہزاروں الفاظ اور جملے آپ کو سنائی دیں گے۔ کیا ان صورتوں میں آپ عربی و فارسی کے نامانوس الفاظ کی بھرمار کو روکنے کے لئے کوئی کامیاب کوشش کرسکتے ہیں، اور اگر دونوں طرف سے ایسی ضد قایم رہی تو کچھ دنوں میں اردو زبان کیا بن جائے گی؟

آپ کو یقیناً حیرت ہوگی کہ آج اردو کے بعض اچھے شعراء اور اچھے ادبا فلم کمپنیوں کے ملازم ہیں، گیت یہی لوگ لکھتے ہیں، مکالمے یہی حضرات مرتب فرماتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں ناموس الفاظ، بیہودہ ترکیبیں اور نہایت رکیک جملوں کی بھرمار ہوتی ہے"

حیرت کی تو کوئی بات نہیں، یہ لوگ بیچارے پیٹ کے مارے ملازمت کرتے ہیں نہ ان کو زبان سے دلچسپی ہے اور نہ ادب سے لگاؤ، نہ ان کا اپنا کوئی خیال ہے اور نہ کسی شئے کے حسن و قبح پر ان کی کوئی فیصلہ کن رائے، جیسا حکم دیا جاتا ہے بجالاتے ہیں اور روپیوں سے لگے رہتے ہیں۔ یہ لوگ بڑی اچھی صلاحیت کے لوگ ہیں، اور عام سرمایہ دار ذہنیت کے مطابق فلم کمپنیاں ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا کر دولت بٹورتی رہتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ فلم کمپنیاں

انھیں ایسی بیش قرار تنخواہیں دیتی ہیں جتنی اس صلاحیت کے لوگوں کو کہیں اور نہیں مل سکتی، لیکن یہ خود غرض آرام کوش اور تعیشات کے دلدادہ کبھی یہ کیوں نہیں سوچتے کہ یہ رقم کہاں سے آتی ہے، اُن ہی مزدوروں اور مفلسوں کے پاس سے جن کے درد و دکھ کا تصور کرکے یہ پیشہ ور مرثیہ خواں ٹسوے بہاتے پھرتے ہیں۔ ہندوستان بھر میں کوئی سینما ہال ایسا نہیں جس کی آمدنی کا بڑا حصہ ۶ ر اور ۴ ر والے ٹکٹوں کی فروخت سے نہ حاصل ہوتا ہو، اور اُن ہی روپیوں سے مالکان سینما اور اس میں کام کرنے والے عیش اُڑاتے ہیں۔

غرض کہ اُن بیچاروں سے کسی خیر کی اُمید ہی نہیں، یہ لوگ محض پیٹ کے بندے ہیں، ضرورت ہے کہ پوری قوت کے ساتھ سینما دیکھنے والوں کی طرف سے اس مسخ شدہ زبان کے خلاف آواز اُٹھائی جائے۔ اس وقت شاید اپنی تجارت کو کامیاب رکھنے کے لئے فلم ساز کمپنیاں مجبوراً صاف ستھری زبان پر زور دینے لگیں گی؛ اور اُمید ہے کہ اس صورت حال میں تبدیلی ہو جائے۔

ہماری اِس ماہ کی تین نئی کتابیں

ادب اور انقلاب ۔ از ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری۔ اُردو کے ادبی انقلاب کے سب سے ممتاز علم بردار کے اُن مقالوں کا مجموعہ جنھوں نے ہماری تنقید نگاری میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔

اِس مجموعہ میں وہ تاریخی مقالہ "**ادب اور زندگی**" شامل ہے جس نے ادبی دنیا میں ہلچل مچادی تھی اور ترقی پسند تحریک کی بنا ڈالی تھی اس کے ساتھ **بنگال کے باغی شاعر قاضی نذرالاسلام** اور **سوویٹ روس کے ادب** پر وہ سیر حاصل مضامین ہیں جنھوں نے ہمارے شاعروں اور ادیبوں کے دل و نگاہ کو وسعت بخشی۔ کتاب کے شروع میں ایک اعلان نامہ ہے جو **پنڈت جواہر لال نہرو**، **منشی پریم چند مرحوم**، **مولوی عبدالحق** اور مصنف کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ۔ مجلد۔ رنگین گرد پوش کاغذ طباعت اعلیٰ

مقالاتِ محمد علی مرحوم۔ مرتبہ رئیس احمد جعفری۔

محمد علی۔ ہندوستان کا آتش نوا زعیم جب تک زندہ رہا، اپنی شعلہ سامانیوں سے محفل کو لذت سوز سے، لطف تپش سے جلنے اور جلتے رہنے کے کیف سے روشناس کراتا رہا یہ اُسی کے مقالات کا مجموعہ ہے۔ درحقیقت یہ بیسویں صدی کی مکمل تاریخ ہے۔ قیمت تین روپئے بارہ آنے۔ مجلد۔ رنگین ٹائیٹل۔

لہریں ۔ از ڈاکٹر شفیق الرحمٰن۔

شفیق الرحمٰن کے افسانے نوجوانوں کے افسانے ہیں جو زندگی کو ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح متعفن اور بدرنگ نہیں بنانا چاہتے۔ اُڑتے ہوئے لمحوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ محبت کرتے ہیں۔ کھیلتے ہیں اور اُن میں سے اکثر زندگی کے روشن پہلو کے ترجمان ہیں۔ ضخامت تقریباً چار سو صفحات مجلد۔ رنگین گرد پوش۔ قیمت۔ تین روپے بارہ آنے

علی اختر

اِنسان اور شیطان

اِنسان

آشنائے دانشِ بیدار ہوں
بے خبر! میں صاحبِ اسرار ہوں

صورتِ اندیشہ ہوں سرگرم سیر
تو سمجھتا ہے، گراں رفتار ہوں

تو دلیلِ جادۂ نا محرمی
میں نشانِ منزلِ اسرار ہوں

میری ہستی، اِک جہانِ رنگ و بو
میں حریفِ ساغرِ سرشار ہوں

بیخودی بھی ہے مری آئینِ ہوش
میں اَزل سے سرخوشِ پندار ہوں

پستیٔ کردار، تیرا اِمتیاز
میں طرازِ عظمتِ کردار ہوں

تو سمجھتا ہے مجھے اِک مشتِ خاک
اور میں اِک عالمِ اَنوار ہوں

میں ضمیرِ حق کا اِک رازِ نہاں
تو کہاں ناداں مری ہستی کہاں!

شیطان

جانتا ہوں اَے فروغِ آب و گِل
تو ہی راز اور تو ہی خود دانائے راز

تیری منزل ہے دلِ یزدانِ پاک
تیری ہستی پر ہے خود فطرت کو ناز

رازِ بیداری ہے تیری بیخودی
تیری سیئے ہے آتشِ مینا گداز

تیری ہستی ہے بسیط و بیکران
وہ تجھے بخشا گیا ہے سوز و ساز

اِس طرف بھی اِک اچٹتی سی نظر
اَے کہ تیری عمرِ آسائش دَراز

اِک چمن تہذیبِ حاضر کا چمن
نبضِ خس میں لرزشِ خونِ بہار

علم کے نغمے، روش اندر روش
عقل کے جلوے، قطار اندر قطار

محفلیں، عشرت سرائے رقص و رنگ
منزلیں، راحت گہِ جام و نگار

جھوم کر اُٹھتا ہوا، اَبرِ نشاط
رُوح پر چھایا ہوا کیفِ بہار

شام، بطنِ زندگی میں محوِ خواب
صبح، ہستی کی جبیں سے آشکار

خودروی کا رازِ منزل پر حجاب		آگہی کا شرحِ باطن پر غبار
نو بہ نو بکھری ہوئی رعنائیاں		دمبدم موجِ ضیا آئینہ کار
عقل، رقصِ جام و مینا پر فدا		محرمی، حسن و جوانی پر نثار

ہر نفس مئے کے شرارے گرمِ رقص
ہر طرف نغموں کے شعلے بیقرار!

اِنسان

محرمِ اسرارِ فطرت، کیا ہے یہہ؟

شیطان

آدمِ خاکی تری دُنیا ہے یہہ!

اِنسان

میں تو اِس سے آشنا اب تک نہیں

شیطان

لیکن اِس میں اب تو کوئی شک نہیں!

اِنسان

ہے یہ میرا عہدِ بیداری کہ خواب؟

شیطان

خود تری آنکھیں تجھے دینگی جواب!

اِنسان

یہ چمن کس طرح کھل سکتا ہے یہ؟

شیطان

تو اگر چاہے تو بل سکتا ہے یہ!

لیکن اب اُس کا ذرا انجام دیکھ
اپنی صبح زندگی کی شام دیکھ!

پھول ہیں شعلے دہکتی آگ کے
کھا رہا ہے آدمی کو آدمی
بجھ رہے ہیں عیش و راحت کے چراغ
جنگ کے طوفان ہیں اُمڈے ہوئے
گونجتی ہے زلزلوں کی دار و گیر
عبرتوں کا، شب کی پیشانی پہ رقص

گر رہی ہے دمبدم برقِ عذاب
امن و آسائش کی مٹی ہے خراب
چھا رہا ہے درد و عبرت کا سحاب
روئے فطرت پر ہیں آثارِ عتاب
عرصۂ ہستی ہے "دیوانے کا خواب"
ظلمتوں کا، صبح کے رخ پر نقاب

ہو گیا ہے قہر، نغموں کا فسوں
بن گئی ہے زہر پھولوں کی شراب!

انسان

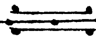
کچھ نہیں، یہ تو ڈراتا ہے مجھے
زندگی یہ زخم کھا سکتی نہیں
زندگی، جس میں سرور و نور ہے
اِک نئی دنیا بسانے دے مجھے

جادۂ حق سے ہٹاتا ہے مجھے!
اپنی زد میں آپ آ سکتی نہیں!
وہ تمدن ہاں مجھے منظور ہے!
تو انھیں راہوں میں جانے دے مجھے!

چل دیا انسان بل کھاتا ہوا
ناز کرتا، جھومتا، گاتا ہوا!!

شیطان

او خدا، یارِ خدا، یارِ اِلٰہ!!!



عبدالماجد دریابادی

غالب کا فلسفہ

۱۶ - فروری ۱۹۴۳ء کو غالب مرحوم کی برسی منائی گئی۔ اس دن لکھنو ریڈیو اسٹیشن سے فلسفی شاہ مولانا عبدالماجد دریابادی نے یہ مضمون نشر کیا تھا۔
کہا جاتا ہے کہ غالب ایک فلسفی شاعر تھا، فلسفی شاعر کا فلسفہ خود فلسفی ادیب بلکہ فلسفی شاہ کی زبان سے سنیئے، شعر کی تفسیر زبانِ شاعری سے اچھی کہی جاتی ہے فلسفہ کا بیان زبان فلسفہ سے بہتر کون کر سکتا ہے؟ غالب کا فلسفہ، مولانا عبدالماجد کا قلم، کیا کہنا ہے، پھولوں میں بہار اور سونے پر سہاگا۔

(مدیر)

فلسفہ کے نام سے گھبرائیے نہیں۔ فلسفہ موٹے موٹے ناموس لغات کا ثقیل، مغلق اصطلاحات کا نام نہیں۔ فلسفہ نام ہے خود شناسی کا۔ زینہ ہے خدا شناسی کا۔ ہم کون ہیں، کیا ہیں؟ ہمارے گرد و پیش کیا ہے؟ ہمارے جذبات کیا ہیں؟ عادات و اطوار کیا ہیں؟ خدا کیا ہے؟ ماسوا کیا ہے؟ بس یہی روزمرہ کے مسئلے ہیں، جن سے ہم آپ کو سب کو دوچار ہونا پڑتا ہے کبھی جان کر، اور کبھی انجان، انھیں کو عقلی اصول پر ایک خاص نظام کے ماتحت ترتیب دے دیجیے اور لیجیے آپ فلسفی ہو گئے۔ پھر غالب غریب، کینٹ اور ہیگل کے کینڈے کے تو انسان تھے بھی نہیں۔ ایک خوش باش، زندہ دل، خوش فکر، طبیعت دار آدمی باتیں کرتے تو ذرا گہری۔ نظر سطح کی نہیں، عمق کے عادی چھلکے پر پڑ کر پھسل جانے والی نہیں، مغز تک پہنچ جانے کے خوگر سوجھ بوجھ غضب کی۔ اپنے ان حکیمانہ تجربوں، اور عارفانہ مشاہدوں کو ادا کرتے، تو کبھی پیاری نثر میں، کبھی دلاویز نظم میں، کبھی شعر کا ساز ہاتھ میں اٹھا لیتے، کبھی نثر کے مائکروفون کو منہ لگا لیتے، شہرت شاعری ہی کی زیادہ ہو گئی، ورنہ تحقیق کی زبان سے تو روایت یہ سننے میں آئی ہے کہ نظم و نثر دونوں کے ماہر تھے، مالک تھے، بادشاہ تھے نثر لکھنے بیٹھے تو قلم میں یہ قدرت، کہ جب چاہا روتوں کو ہنسا دیا، جب چاہا ہنستوں کو رلا دیا۔ شعر کہنے پر آئے تو زبان میں یہ اثر کہ سننے والوں کو لٹا دیا۔ مرجھائے دلوں کو کھلا دیا؛ فطرت بشری کے رازدار ہی جو ٹھہرے اور حکمت و معرفت کے شیدائی۔ معقولیت کے بول لطافت و ظرافت کے سروں میں الاپتے۔ ابھی آہ کا رنگ جما دیا، ابھی واہ کا نقش بٹھا دیا۔ یہی ان کی حکمت، یہی ان کا فلسفہ۔ یہی ان کی شاعری کا پیام، یہی ان کی زندگی کا کارنامہ۔

دل فطرت سے شوخ لے کر آئے تھے اور دماغ بیدار۔ شعر کمسنی ہی سے کہنے لگے تھے، جو رنگ طبیعت کا شروع سے تھا آخر تک رہا۔ جوں جوں سن بڑھتا گیا، پختگی آتی گئی؛ دنیا کی بے ثباتی، کائنات کی بے حقیقی کا نقش شروع ہی سے دل پر بیٹھ گیا تھا۔ جوانی کا زمانہ

رندی و سرمستی کا ہوتا ہے۔ جھومتے جاتے ہیں، لیکن اس بےہوشی میں اتنا ہوش رکھتے ہیں ؎

قطعِ سفرِ ہستی و آرامِ فنا ہیچ
رفتارِ نفس بیشتر از لغزشِ پا ہیچ
کس بات پہ مغرور ہے اے عجزِ تمنا
سامانِ دوا وحشت و تا ثیرِ دعا ہیچ

زبان کی سلاست، ترکیبوں کی صفائی اس سن میں کیسے آسکتی تھی، لیکن خیال کی ندرت، طبیعت کی جدّت اس نوشقی میں بھی کچھ ڈھکی چھپی نہیں ہے۔

مہینے کا نیا چاند ہم آپ سب ہی دیکھتے ہیں۔ لیکن حضرت غالب کا دیکھنا ہی کچھ اور تھا۔ حکیمانہ نظر نے دیکھا اور نکتہ پیدا کیا کہ چودھویں کا جو اتنا بڑا طباق سا چاند ہوتا ہے وہ آخر پیدا ہوتا ہے اسی منحنی، کم رو، اور خیال کی طرح نازک و باریک ہلال سے۔ گویا کمال کی بنیاد، ضعف و اضمحلال ہی سے پڑتی ہے۔ ؎

بدر ہے آئینہ طاقِ ہلال
غافلاں! نقصان سے پیدا ہے کمال

مذہب کی تعدد سے، ظاہری رسوم کی سختیوں سے اور فرقیانہ غلو سے تنگ آکر کہتے ہیں، کہ سکونِ خاطر منظور ہے تو بس توحید سے لو لگا لیجئے، وحدت کی خانقاہ میں کنج نشین ہو جائیے، اور یک داں، یک بیں، یک گو بن کر رہ جائیے ؎

تا چند ناز مسجد و بتخانہ کھینچیے
جوں شمع دل بخلوتِ جانانہ کھینچیے

کائنات سے انسان سبق لینا چاہے، تو ذرہ ذرہ سبق دینے کو تیار ہے۔ اس میں تاج محل اور فقیر کی جھونپڑی کی تفریق کیسی؟ حقیقت شناسی کی آنکھ کے لیئے بجلی کا قمقمہ اور مٹی کا دیا دونوں ایک ہیں۔ فطرت کی مشاطہ صنعت ربوبیت کی کنگھی دستِ قدرت میں لیے مانگ چوٹی ان کی بھی درست کرتی ہے ان کی بھی۔ اسی مضمون کو کہیں یوں ادا کیا ہے۔ ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

اور کہیں ان الفاظ میں باندھا ہے ؎

غافل بہ وہم ناز خود آرا ہے ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں طرّہ گیاہ کا

موتی کی قدر و قیمت سب جانتے ہیں، یہ فطرتِ بشری کا عارف کہتا ہے کہ موتی بنتا ہے پانی کے قطرہ سے لیکن ایسا ہی پانی کا قطرہ ایک اور بھی تو ہے موتی سے کہیں زیادہ قیمتی۔ اسے حضرت انسان آنکھوں ہی آنکھوں میں رکھتے ہیں اور باہر اسی وقت نکالتے ہیں، جب چوٹ پڑ لیتی ہے، دل پہ نہ سہی، کم از کم جسم ہی پر سہی، سلسلۂ موجودات میں جس کا جیسا ظرف ویسا ہی اس کا مرتبہ ؎

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

فرماتے ہیں کہ بشر کے گناہ بیشک بے حد و بیشمار لیکن فطرت میں جو قدرتِ عصیاں، سیلانِ فسق، طاقتِ گناہ رکھ دی گئی ہے، وہ تو اس سے بھی کہیں زائد ہے۔ انسان گناہ کہاں تک کریگا، جتنے بھی کرے گا، پھر بھی بہت سے چھوٹ ہی جائیں گے، کرسکتا ہوگا، مگر کریگا نہیں پھر کیا جب وقت جزائے کامل کا آئے گا، تو عادلِ حقیقی کی کریمی بندہ کی اس بناوٹ کا لحاظ بھی نہ رکھیگی؟ اس مضمون کو کئی کئی طرح ادا کیا ہے۔ کہیں یوں ؎

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

اور کہیں یوں ؎

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

اور کہیں یوں بھی ؎

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

رات کو شبنم پڑتے ہم نے آپ نے سب نے دیکھا ہے
چمن کی زمین بھیگی پڑی ہے کہ صبح آفتاب نکلا، اور اس کی
کرنوں کے ساتھ وہ ساری نمی رخصت اس منظر پر بھی کبھی
کبھی نظر پڑی ہوگی۔ غالب کی نظر اس پر بھی گڑ گئی۔ آفتاب
کا کام تو زندگی دینا ہے، نشو و نما بخشنا ہے، اور بعض قدیم
فلاسفہ کا مقولہ ہے کہ شبنم پیدا بھی آفتاب ہی سے ہوتی ہے
لیکن ادھر کرن پھوٹی، ادھر شبنم کا وجود بھی رخصت
ہوگیا کل نے جزو کو اپنی طرف کھینچ لیا، اپنے میں جذب کرلیا
ظاہر میں فنا اور دراصل بقا حاصل ہوگئی، اور کہتے ہیں فلسفۂ
وحدت وجود کے اندر گم ہو کر کہتے ہیں، کہ یہی حال انسان
کا ہے۔ ممکن الوجود کی تو عین تمنا یہی ہے کہ واجب الوجود اس
پر توجہ کرے۔ اس پر تجلی رحمت کا عکس ڈالے، اور اُسے
اپنے اندر جذب کرلے ———— بندہ کا وجود یوں بھی
تو مالک کے سامنے بمنزلۂ عدم کے رہتا ہے ؎

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

اور پھر یہی شربت ایک، دوسرے گلاس میں ؎

کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوہ نے
کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستان کا

مخلوق کا وجود تو خود اس کی فنا کی دلیل ہے۔ وجود نہ ہو تو
فنا کا عمل ہو کس چیز پر؟ مرزا فرماتے ہیں کہ بجلی کا گرنا تو
سب نے دیکھا، یہ بھی دیکھا کہ بیچارے دہقان کی کی کرائی
محنت سب دم بھر میں غارت گئی، اور جو غلّہ کا انبار تھا،
وہ راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ لیکن دہقان ہی نے تو آخر
دوڑ دھوپ کرکے اس آفت کا محل تیار کیا تھا۔ اور اس
آگ کے لئے مسالہ فراہم کیا تھا۔ ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

فنا کا رنگ حضرت غالب پر شروع سے غالب رہا۔
شوخیوں اور رنگینیوں کے درمیان غالب رہا، رندی اور
آزاد مشربی کے باوجود غالب رہا۔ کہیں کہیں تو یہ لے
ہلکی ہے۔ دھیمے سُروں میں کہتے ہیں۔ ؎

نغمہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیئے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

لیکن اکثر یہ مستقبل کا صیغہ حال سے بدل گیا ہے۔
اور صاف صاف کہنے لگے ہیں کہ یہ وجود اب بھی نابود ہے،
اس کاروبار حیات کی مثل طلسمات نمود ہے، حقیقۃً معدوم
اور صرف بظاہر موجود ہے۔ کہتے ہیں ؎

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

برطانیہ میں ایک فلسفی عرصہ ہوا، بارکلے کے نام کا
گزرا ہے، وہ بھی کچھ ایسی ہی تعلیم دے گیا ہے۔ پھر
کہتے ہیں ؎

ہاں کھائیو مت، فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں ؎

عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر
کب تک خیالِ طرۂ لیلیٰ کرے کوئی!

اور پھر کہتے ہیں، اور فلسفہ کی خشکی میں شاعری
کی رنگینی پیدا کرکے کہتے ہیں ؎

شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

تلاش کیا جائے تو دیوان بھر میں شاید یہی مضمون
سب سے زیادہ نکلے۔ خدا جانے کتنے مختلف طریقوں
سے اسے پیش کیا ہے۔ عجب نہیں کہ یہ محض قال نہ ہو
حال ہو۔

زندگی کی تلخیوں کے تجربہ نے معتقد اس کا بھی
بنا دیا تھا کہ زندگی بھر اس بند سے رہائی پانے کی کوئی
صورت ہی نہیں۔ جب تک کہ انسان اس آب و گل
کی دنیا میں ہے، کچھ بھی کرے یہ جھگڑے بہرحال اس کا

ساتھ چھوڑنے کے نہیں۔ مرزا کی آپ بیتی اُن کی ذاتی نہیں نوعِ بشر کی آپ بیتی ہے۔ لیکن شعر کے موزوں سانچہ میں لطیف قالب میں ادا تو اُنھیں کی زبان سے ہو رہی ہے۔ ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

یہی مفہوم، ردیف و قافیہ اور وزن کی تبدیلی کے ساتھ ؎

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اور یہ عدم ہستی نما جو کچھ اور جیسا کچھ بھی موجود ہے، اُس کی بھی بساط کیا، اور پائداری کتنی؟ ؎

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم ہے بس رقصِ شرر ہونے تک!

بعض ادنیٰ فلسفیوں اور ناقص قسم کے زاہد دل کو دیکھا ہوگا کہ خلق سے اپنے آپ کو گویا بالکل علیٰحدہ کر لیتے ہیں اور ترک و تجرید کے معنی یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ماں اور باپ، بھائی اور بہن، ہمسایہ اور ہم وطن، کے حقوق کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ غالب کی اصطلاح میں اس کا نام "وحشت ہے" اور اُن کا فرمانا ہے کہ اِس وحشت کا مستحق تو خود اپنا نفس ہے، نہ کہ دوسرے۔ ؎

وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں
اپنے سے کر نہ غیر سے، وحشت ہی کیوں نہ ہو

حسد کا علاج اکثر حکمائے اخلاق نے لکھا ہے۔ مرزا صاحب کی تشخیص ہے کہ یہ مرض پیدا ہوتا ہے تنگ نظری سے۔ اور اِس لئے اُن کے مطب میں اِس کا علاج نظر کی وسعت ہے۔ ؎

حسد سے دل ہے گر افسردہ، سرگرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

مذہب:- اخلاق کی اصل اور بنیاد بہت سے حکیموں، عارفوں کے نزدیک اِخلاص ہے۔ غالب بھی اِسی مشرب کے پیرو ہیں۔ اُن کی شریعتِ شعری کا فتویٰ ہے کہ وضعداری بجائے خود قابلِ صد قدر و مستحقِ ہزار داد ہے ؎

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

بعض اہلِ باطن کا قول ہے کہ حکمتِ کاملہ کو منظور ہی جب یہ ہو کہ بندہ فلاں فلاں حدود کو توڑ دے، تو اب بندہ کا اُس سے جھجکنا اور رُکے رہنا خود ایک معصیت اور خود بینی ہے۔ یہ مضمون اب مرزا صاحب کی زبان سے سُنیئے۔ ؎

جب کرم رخصتِ بیباکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

یہی مفہوم ایک دوسرے دلکش و موثر انداز میں ؎

کرتا ہوں میں اسے نامۂ اعمال میں نقل
کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی

عارف اور عاقل سب ہی کہتے آئے ہیں کہ نا محدود کا پورا پتہ محدود کیسے چلا سکتے ہیں، اور جو مطلق ہے اُسے کوئی مقید اپنی عقل و فہم کی گرفت میں کب لا سکتا ہے؟ یافت ہر ایک کی، بس اپنے مرتبہ کے لایق ہوتی ہے۔ غالب نے بھی اِس حقیقت کو پایا ہے، اور ذرا دیکھیے گا کس شاعرانہ، بانکپن سے کسے اپنے انداز میں دوہرایا ہے۔ ؎

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

ذات کے طالب کو بھلا تجلیِ صفات سے کب تسلی ہو سکتی ہے؟ غالب، صوفیوں کی بتائی ہوئی، عارفوں کی سمجھائی ہوئی اِس حقیقت کو دوہراتے ہیں، اور بیان میں شوخ زبانی کا پیوند لگاتے جاتے ہیں، شاید اِس لئے کہ شاید سُننے والے کہیں بھول نہ جائیں کہ غالب خانقاہ کے بوریہ پر نہیں، مشاعرہ کی مسند پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ؎

دونوں جہان دیکے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں!

عبرت کا رنگ کلام میں ہمیشہ سے موجود تھا سن بڑھتا گیا، اور یہ رنگ پختہ سے پختہ تر ہو گیا۔ یہاں تک کہ یہ قطعہ ارشاد ہوا، سرتا سر مرصع۔ مدۃ العمر کے تجربات کا نچوڑ، سارے فلسفۂ حیات کا خلاصہ، رویداد زندگانی کا لب لباب۔

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار گر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہے
ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

قطعہ کیا ہے گویا شاعر کا وصیت نامہ ہے۔ اس قطعہ کا زمانہ صاحب غالب نامہ کی تحقیق ہے، کہ ۱۸۲۰ء ہے گویا غالب کی عمر اس وقت کل ۳۰ سال کی تھی۔ اگر یہ صحیح ہے تو کہنا چاہیئے کہ غالب عین جوانی ہی میں بوڑھوں کے ہم سن ہو چکے تھے۔

آخر عمر کے خطوط، عبرت اور فنا کے مضامین سے پٹے پڑے ہیں ۱۹ر جون ۱۸۶۳ء کو یعنی اپنی وفات سے کوئی چھ سال قبل ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"روح میری اب جسم سے اس طرح گھبراتی ہے
جس طرح طائر قفس میں۔ کوئی شغل، کوئی
اختلاط، کوئی جلسہ، کوئی مجمع پسند نہیں۔
کتاب سے نفرت، شعر سے نفرت، جسم سے
نفرت۔ یہ جو کچھ لکھا ہے بے مبالغہ اور بیانِ واقع ہے

"خرم آں روز کزیں منزلِ ویراں بروم"

منزلِ ویران کی ویرانی کا احساس روز بروز بڑھتا گیا۔ ایک دوسرے مکتوب میں وفات سے ساڑھے تین چار سال قبل نومبر ۱۸۶۵ء میں تحریر کرتے ہیں:-

"نمایش گاہ بریلی کی سیر کہاں اور میں کہاں!
خود اس نمایش گاہ کی سیر سے جس کو دنیا
کہتے ہیں، دل بھر گیا۔ اب عالمِ بے رنگی
کا مشتاق ہو کر۔ لا الہ الا اللہ۔ لا موجود الا اللہ
لا مؤثر فی الوجود الا اللہ"

آخری زمانہ کے خطوط میں عموماً اپنا نام خاتمہ پر یوں لکھتے ہیں "نجات کا طالب، غالب"، "مرگ ناگاہ کا طالب، غالب"۔ اور ایک آخری خط کی بالکل آخری سطریں یہ ہیں:-

"زندہ ہوں، مردہ نہیں، بیمار بھی نہیں۔
بوڑھا، ناتواں، مفلس، قرضدار، کانوں
کا بہرہ، قسمت کا بے بہرہ، زیست
سے بیزار، مرگ کا امیدوار، غالب"

جوانی میں کبھی یہ شعر کہا تھا، زبانوں پر آج تک چڑھا ہوا ہے، اور معنی خدا معلوم کیا کیا لیے جا رہے ہیں۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت غالب
دل کے خوش رکھنے کو لیکن یہ خیال اچھا ہے

اردو کے اس بہترین غزل گو کی زندگی بجائے خود ایک غزل تھی، اور اس غزل کا مطلع آپ نے ابھی سن لیا ہے۔ اب مقطع بھی سن کر فاتحہ خیر کے لئے ہاتھ اٹھا دیجیے۔ حالی کی روایت ہے کہ آخر وقت بار بار اپنے اس شعر کو پڑھا کرتے

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

اَفسر احمد نگری

اِقبالؒ اور بندۂ محکوم

محکوم　اَے ترے نغموں سے روئے حاکمیت بے حجاب　　یہ زوالِ مردِ مومن بے حقیقت یا کہ خواب
ہٹ گئی وہ محفلِ عزم و عمل مثلِ سراب　　سنگِ خارا ہوگیا ہے زندگی کا لعلِ ناب
کیا ملے؟ کیونکر ملے؟ گم کردہ منزل کا سُراغ　　ساحرِ افرنگ کے مسحور ہیں سب شیخ و شباب

اِقبالؒ　آبتاؤں تجھکو شانِ عارف و مردِ مقام　　وارثِ دینِ مُبین۔ آتش نسب۔ والا مقام
عشق رزمِ زندگانی عشق تیغِ بے نیام　　عشق کی گرمی سے پیدا تابشِ کاسِ الکرام
اَب کہاں وہ عشق و مستی کا جمالِ جاوداں　　وہ جنونِ دعوتِ حق وہ خیالِ ننگ و نام
اَب کہاں وہ عشق و مستی کا جلالِ بے اماں　　مردِ مومن کو مُبارک ہو نمازِ بے قیام
کاروانِ عشق پہنچا منزلِ مقصود پر　　ہیں خرد کے کارواں لیکن ابھی دو راز قیام
آتشِ افرنگ کے شعلوں میں گھِر کر رہ گیا　　مکتبِ اسرارِ فطرت کا جوانِ سبز فام
عشق نے مجھ کو عطا کی سوزشِ دردِ دروں　　تھا مرے افکار کا سرمایہ سوزِ ناتمام

محکوم　یاد ہے مجھکو ابھی تک وہ ترا صرفِ بلند　　کر دیا بحرِ معانی تو نے اک نقطے میں بند
بندۂ محکوم کو کیا ہو اسیری سے خطر　　"قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند"

اِقبالؒ　تیرا قلب پُر سکوں تھا محوِ وردِ لا اِلٰہ　　آج ہے بے ربطئ افکار کی آماجگاہ
اَے اسیرِ جادۂ وادئ تہذیبِ نوی　　پستئ فطرت سے ہے تو بے گلیم و بے کلاہ

محکوم　بادۂ آلام سے پُر ہے اَیاغِ زندگی　　کس طرح روشن ہو مومن کا چراغِ زندگی
اِقبالؒ　اُس کی ہے شاہنشہی دنیائے مہر و ماہ پر　　تیز ہے مانندِ تیغِ خونچکاں جس کی نظر
جس کی فطرت بے نیازِ گردشِ شام و سحر　　جس کی ہستی کامیابی کا جمالِ منتظر
جس کے حق میں پھول بنجاتا ہے ہر خارِ خرد　　بے وجودِ ذاتِ باری کا وہی پیغامبر
بندۂ آزاد کی آواز صوتِ سرمدی　　بندۂ محکوم کی آواز بالکل بے اثر
خاکِ محکومی سے گرد آلود ہے تیری جبین　　زندگی خود داریوں کا نام ہے اے بے خبر

احمد ندیم قاسمی

نئی سارنگی

ابھی گیت ختم نہیں ہوا تھا کہ سارنگی کا تار ٹوٹ گیا گیت گانے والا رک گیا۔ سازندے کی انگلیاں ڈھیلی ہو کر ٹکنے لگیں اور سارنگی کے ٹوٹے ہوئے تار کی مردہ جھنجھناہٹ ایک لمحہ تک دھندلے کمرے میں لڑکھڑا کر ختم ہو گئی۔ ایک کونے میں لیٹے ہوئے بوڑھے نے آنکھوں کو چادر سے مل کر ایک لمبی آہ بھری اور بولا " سارا لطف جاتا رہا ——— مجھے تو یوں محسوس ہوا ہے جیسے چنبیلی کے تازہ پھول کیچڑ میں گر گئے ہوں " ——— اور اس کے بعد اس موضوع پر ہر شخص نے اپنی اپنی رائے ظاہر کی دیر تک کمرے کی دھواں دھار فضا میں ہنگامہ سا برپا رہا کہ اچانک سازندہ پکار اٹھا " تار جڑ گیا ہے ! " ———

اور اس نے انگلی سے اس نئے جڑے ہوئے تار کو چھیڑا۔ ایک پتلا سا شریر نغمہ تار کی لرزشوں سے ٹپک کر چار طرف پھیل گیا اور سب چہروں پر مسکراہٹیں کھیلنے لگیں سب آنکھیں گانے والے پر جم گئیں جو حقے کا کش لگا کر سامنے چولھے میں بجھتے ہوئے انگاروں کو گھور رہا تھا سازندہ بولا " حمید خاں تار جڑ گیا ہے "

" لیکن یہ پھر ٹوٹ جائے گا " حمید خاں نے انگاروں سے نظریں اٹھائے بغیر کہا " یہ پھر ٹوٹ جائے گا۔ اور میرے گیت کا ستیاناس کر دے گا۔ میں ایسی سارنگی کے ساتھ نہیں گا سکتا۔ کوئی نئی سارنگی منگواؤ "

" نئی سارنگی ؟ " سازندے نے ہراساں لہجے میں کہا، " نئی سارنگی ہے تو سہی لیکن ——— لیکن وہ ابھی بالکل نئی ہے اور ——— اور بالکل نئی ہونے کی وجہ سے وہ اچھی نہیں بجے گی ! "

سازندے پر ہر طرف سے سوالات کی بوچھاڑ ہونے لگی " نئی سارنگی اچھی نہیں بجے گی ! کیسی الٹی بات کرتا ہے ——— حمید خاں کے لئے سچ مچ کوئی نئی سارنگی ہونی چاہیئے "

اور بوڑھا کونے سے اٹھتے ہوئے بولا " ہاں ہاں۔ نظام، لپک کر نئی سارنگی لے آ، چودھری جی اکی بہت تعریف کر رہے تھے۔ تمہاری اس سارنگی کے تو سارے تار ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔ تنے ہوئے تاروں سے جو آواز پیدا ہو گی وہ حمید خاں کے پیارے گیتوں کو اڑا کر جانے کدھر لے جائے گی "

" مگر ——— " نظام سازندہ ہچکچایا " مگر وہ تو بالکل نئی ہے "

" تو کیا قبر میں لے جائے گا اسے ؟ " حمید خاں بولا۔

اور نظام سازندہ پرانی سارنگی کو ایک ہاتھ میں لٹکائے دھواں دھار کمرے سے نکلا اور ——— اور پھر لوٹ کر نہ آیا۔ بہت دیر تک اس کا انتظار کیا گیا۔ لوگ وہیں فرش پر سو گئے اور جب قریب کی مسجد میں مولوی صاحب نے صبح کی اذان دی تو سب اٹھے اور ایک دوسرے سے پوچھا " کیا نظام ابھی تک نہیں آیا ؟ " ———

لیکن ہر ایک چہرہ افسوسناک حد تک خالی تھا " نظام سازند

کدھر گیا —— کدھر گیا نظام سازندہ!" —— اِس کمرے سے یہ ہراساں سوال نکل کر سارے گاؤں میں پھیل گیا۔ سب لوگ چودھری جی کے مکان پر گئے اور اُن سے نظام کے متعلق پوچھا۔ نظام کو اُنھوں نے ایک کوٹھڑی رات بسر کرنے کے لئے دے رکھی تھی۔ چودھری جی لوگوں کے ساتھ ہو لئے۔ کوٹھڑی کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر گئے تو نہ سارنگیاں تھیں نہ سارنگیاں والا! ایک طرف کونے میں ایک ٹوٹی ہوئی چلم پڑی تھی اور دوسری طرف مٹی کا ایک پیالہ —— چھت میں ایک ہنڈی چیخ رہی تھی —— ٹوٹے ہوئے تار کی جھنجھناہٹ کی طرح!۔

"یہ کیا مذاق ہے؟" چودھری جی بولے "تم نے اسے ضرور چھیڑا ہوگا۔ بے چارہ سادہ آدمی ہے۔ مجھ سے اُسے اِس قدر محبت ہے۔ وہ مجھ سے پُوچھے بغیر یہ گاؤں کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ کیا بات ہوئی؟"

اور وہی بوڑھا بولا "بس جی ہم نے اُسے نئی سارنگی لانے کو کہا اور ——"

"نئی سارنگی؟" ذیلدار نے پوچھا "ٹھیک ہے۔ اب سارا معاملہ میری سمجھ میں آگیا ہے۔ میں بھی ایک بار اُسے نئی سارنگی بجانے کو کہا تھا۔ لیکن وہ ٹال گیا۔ تم نے اُس پر بہت دباؤ ڈالا ہوگا —— بے چارہ!"

اور لوگ حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ کہ نئی سارنگی بجانے سے وہ اِس قدر کیوں گھبراتا ہے اور پھر اُسے ایک ریشمی کپڑے میں لپیٹے ہوئے اپنے ساتھ ساتھ کیوں اُٹھائے پھرتا ہے؟

حمید خاں پردیس کا رہنے والا تھا۔ جب گاؤں میں کوئی سارنگی بجانے والا نہ رہا تو وہ بھی اپنے گاؤں کو چلدیا اور چوپال کی مجلس سُونی ہوگئیں۔ لوگ الاؤ کے اِرد گرد بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہتے۔ کسی نئے خریدے ہوئے بیل کے مڑے ہوئے سینگوں کے تذکرے ہوتے۔ کسی نئے کبڈی کھیلنے والے کی آن بان کی تعریفیں ہوتیں۔ موضوع بدلتے اور پھر پھر کر نظام سازندے کی یادمیں تبدیل ہوجاتے، ہر شخص اپنے اِرد گرد ایک سنسان سا خلا محسوس کرنے لگتا۔ لبوں پر مسکراہٹیں سمٹ کر غائب ہوجاتیں اور چہروں پر اداسیاں برسنے لگتیں۔ پُراسرار سازندے کی پُراسرار سارنگی کے دیر تک تذکرے ہوتے رہتے اور آخر لمبی لمبی آہیں بھرتے سب لوگ ایک ایک کرکے چوپال سے اُٹھ جاتے۔ الاؤ کے انگاروں پر نرم راکھ کی تہ اُبھر آتی اور چاروں طرف آزردہ سا سناٹا چھا جاتا!

دو مہینے گزر گئے اور نظام کو گاؤں والے تقریباً فراموش کر بیٹھے۔ ایک روز دوپہر کو چوپال پر ایک لڑکا دوڑتا ہوا آیا اور تالی بجا کر بولا "نظام سارنگی والا آرہا ہے!"

"نظام سازندہ؟" چوپال پر بیٹھے ہوئے ہر شخص نے پوچھا "کہاں؟" سب یک زبان ہوکر بولے۔ اور لڑکا چوپال کی سیڑھیاں اُتر کر ہانپتے ہوئے بولا "بڑے آدے کی موڑ پر —— سارنگی اُٹھائے آرہا تھا"

"ایک ہی سارنگی؟" ایک بوڑھے نے پوچھا؟

اور لڑکا پلٹ کر بولا "نہیں نہیں۔ دو سارنگیاں۔ ایک ہاتھ میں ایک بغل میں"

لوگ آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے اور چند لمحے بعد نظام چوپال پر آنکلا۔ کاندھوں پر لمبے لمبے گرد آلود بال بے رونق ہونٹوں پر کھسیانی مُسکراہٹ "السّلام علیکم" کہہ کر ایک کھاٹ پر بیٹھ گیا اور بولا "بھئی مجھے معاف کرنا۔ اُسی روز میں نئی سارنگی اٹھانے گیا تو رستے میں اپنی بوڑھی ماں یاد آگئی۔ سوچا یہ سارنگیاں تو پھر بھی بجتی رہیں گی۔ پہلے اُسے دیکھ آؤں۔ چودھری جی کو بھی نہ ملا۔ وہ بھی ناراض ہوں گے۔ مگر خیر۔ اب واپس آگیا ہوں —— پاؤں پڑ کر منالوں گا!"

"بھئی ہم تمہیں بہت یاد کرتے رہے۔ چوپال پر اکثر تمہارا ذکر ہوتا تھا" ایک نوجوان بولا۔

نظام مسکرایا "اور میرے ذہن سے بھی تمہارا

گاؤں کبھی نہیں بنا۔ مجھے یہ چوپال، یہ گلیاں، ان گلیوں کے آس پاس رہنے بسنے والے ——— سب یاد آتے رہے۔ حمید خاں یہاں ہوتا تو بڑا مزا آتا!"

"حمید خاں؟" ایک شخص بولا "حمید خاں پچھلے دنوں یہاں آیا تھا۔ بے چارے کا گلا بیٹھ گیا ہے، کہتے ہیں اس نے سنکھ پھانک لیا ہے، بات بھی مشکل سے کرتا ہے، یہاں آیا۔ اور گلیوں میں حیران پریشان پھرتا خدا جانے کدھر نکل گیا!"

"کیا بات ہوئی؟" نظام بولا "کیا بات ہوئی؟" ——— اس نے اپنے آپ سے سرگوشی کی "مگر خیر میں تمہیں کل چودھری جی کی لڑکی کی شادی پر نئی سارنگی بجا کر سناؤں گا تو لطف آجائے گا سب کو"

وہی نوجوان بولا "مگر وہ شادی تو کب کی ہو چکی۔ تاریخ بدل دی گئی تھی!"

"ہو چکی؟" نظام بولا۔ اس کی آنکھیں بھر آگئیں ہونٹ سمٹ کر کیڑے سے بن گئے۔ نہایت تیزی سے

اس نے سارنگی پر لپٹا ہوا ریشمی کپڑا کھولا اور بولا "تو پھر تمہیں آج ہی سنائے دیتا ہوں" ——— اور پھر سارنگی کو گود میں جما کر اس کے تاروں پر ایسے زور سے انگلیاں ماریں کہ سب تار کٹ گئے اور کئی بل کھا کر تھرانے لگے۔ ایک بھیانک سا نغمہ بلند ہوا اور چوپال کی منڈیر پر بیٹھی ہوئی چڑیوں کا غول چر چر بولتا اڑا اور مسجد کے میناروں کے چکر کاٹتا اوپر اٹھ گیا!

"یہ کیا؟" چوپال پر بیٹھنے والے پکار اٹھے!

اور نظام نے سارنگی کو گھما کر چوپال کی چھت پر پھینکتے ہوئے کہا "جی نئی سارنگیاں اسی طرح بجا کرتی ہیں! ——— پرانی سارنگی سے ایک بہت دکھی نغمہ نکلتا وہ چوپال کی سیڑھیاں اترا اور بڑے آدے کا موڑ مڑ کر غائب ہو گیا۔ چودھری جی کے مکان پر کھڑے ہوئے مرغے نے گردن بلند کر کے زور سے اذان دی ——— اور پھر ہر طرف آزردہ سناٹا چھا گیا!

آئینہ حیرت

عبدالمجید حیرت

دل کو سنبھالنا کوئی آساں ہے آج کل　　اس کا تو بس خدا ہی نگہباں ہے آج کل

اتنا بھی ہو سکا نہ کسی سے کہ پوچھتا　　کس فکر میں یہ سوختہ ساماں ہے آج کل

وجہ کشیدگی بھی تو ایسی نہیں کوئی　　پھر کیوں کوئی کسی سے گریزاں ہے آج کل

ایسا بھی ایک درد کسی کے جگر میں ہے　　جس کا کوئی علاج، نہ درماں ہے آج کل

دونوں طرف مزاج و طبیعت کا اختلاف　　بد قسمتی سے اور نمایاں ہے آج کل

رہ کر قریب بھی تو کوئی دور دور ہے　　یہ دل اسی لئے تو پریشاں آج کل

حیرت ہزار صبر کا پیکر سہی مگر
وہ بھی تو ان کے ہاتھ سے نالاں ہے آج کل

اندرجیت شرما

نسیمِ سحر

کس ناز کس ادا سے نسیمِ سحر چلی — بو کی طرح رواں ہوئی مثلِ نظر چلی
باغوں کا رُخ کیا تو گراتی ثمر چلی — شبنم کے پتیوں پہ لٹاتی گہر چلی
پھولوں کے جام بادۂ مستی سے بھر چلی — اہلِ چمن کو خواب سے بیدار کر چلی

رُوئے چمن کی دیکھ کے زینت مچل پڑی
سبزہ کو چھیڑ چھاڑ کے لہرا کے چل پڑی

تختے گلوں کے چشم زدن میں کھلا چلی — خوشبو کے اور شمیم کے دریا بہا چلی
سجدہ میں شکر کے لئے شاخیں جھکا چلی — چڑیوں کو شاخ شاخ پہ جھولا جھلا چلی
پتوں کو لڑکھڑا دیا باجا بجا چلی — بزمِ طرب کا رنگ چمن میں جما چلی

سنبل کی زلفِ ناز کو سلجھا کے چل پڑی
دامن کو خار خار سے الجھا کے چل پڑی

باہر چلی چمن سے اڑاتی نشاں چلی — عیش و طرب کا ساتھ لئے کارواں چلی
مردہ دلوں کی بن کے مسیح زماں چلی — کھوتی ہوئی زمانہ کا دردِ نہاں چلی
دیتی چلی پیامِ بقا کا جہاں چلی — بن کر چمن کے واسطے رُوحِ رواں چلی

پھر ٹھن گئی جو مہر سے جھلا کے چل پڑی
میداں کی سمت بڑھ گئی گرما کے چل پڑی

صمد رضوی

جَدیدشَاعری پَرایکْ نَظَر

(اِس مضمون کی ایک قسط جون ۱۹۴۳ء کے جامعہ میں چھپ چکی ہے۔ ذیل کا مضمون اِسی کا سلسلہ ہے)

شاعری کی اُن مختلف تعریفوں کو سامنے رکھتے ہوئے جو اُردو اور انگریزی کے اَدیبوں نے بیان کی ہیں میں اِس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ شاعری کی ظاہری علامات مثلاً بحر، رَدیف وقافیہ وغیرہ کے علاوہ جن کا وجود فنِ موسیقی کے قیام وبقا کے لئے ازبس ضروری ہے، شاعری کے خصوصی لَوازمات حسبِ ذیل ہوں گے:۔

"حسَن کارانہ تخیل، وجد آفریں تاثر، سرور وانبساط، سوز وگداز یا دیگر انسانی جذبات مثلاً نفرت، رشک، حسد، اُمنگ، اُمید خواہش وغیرہ کو متاثر کرنیوالی خصوصیات؛ ایک سچا تاثر یا دینے والا جذبہ، قلب وذہن میں تحریک پیدا کرنے والی ایک نفسیاتی موج، جوش، سادگی اور اصلیت، ہر ایسا خیال یا جذبہ جو زندگی کو آگے بڑھانے کی طرف مائل ہو۔"

شاعری کے مذکورۂ بالا مفہوم کو معین کر لینے کے بعد میں چند شاعری کی چند مثالیں دے کر یہ واضح کروں گا کہ آیا یہ شاعری ہے یا صرف خالی خولی الفاظ، بے مطلب جملے اور بے رَبط خیالات۔ میں نے شاعری کا جو مفہوم معین کیا ہے ممکن ہے کہ اُس پر یہ اعتراض کیا جائے کہ یہ مفہوم "قدیم مُفکّرین" کے خیالات سے اخذ کیا گیا ہے۔ اُس کو زمانۂ حاضرہ کے ماحول، تقاضوں، اور اقتصادی حالات سے کوئی تعلق نہیں، اور چونکہ ہم ماضی کے تصوّرات، رَجحانات اور میلانات کے خلاف ایک نیا نظام قایم کرنے کے لئے جنگ کر رہے ہیں، اِس لئے یہ مفہوم نہ ہمارے لئے قابل قبول ہے اور نہ ہی ہماری شاعری کے جانچنے کا صحیح معیار قرار دیا جا سکتا ہے۔" اِس اعتراض کا اور اسی قسم کے دوسرے اعتراضات کا جواب میں تفصیل سے اِسی مضمون کے دوسرے حصوں میں دونگا۔ یہاں صرف یہ تبلا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے اِس مفہوم کو شاعری کے مختلف پہلوؤں پر، مختلف نقاطِ نظر سے، محتاط غور وفکر کرنے کے بعد معین کیا ہے۔ اور یہ مفہوم اپنی خصوصیت، جامعیت اور معنویت کے لحاظ سے "اِنسانی اور فطری" ہے اور انسانی اور فطری تقاضوں پر مبنی ہے۔ اِس مفہوم کو ماحول کے آئے دن کی تبدیلیاں، سیاسی انقلابات، اور جغرافیائی حد بندیاں مٹا نہیں سکتیں۔ یہ مفہوم ہر زمانہ میں اور ہر ماحول میں موجود رہا ہے اور آئندہ بھی رہیگا سانچے بدلتے رہے ہیں اور بدلتے جائیں گے، اندازِ بیان اور اظہارِ خیال کے طریقے تبدیل ہوتے رہے ہیں اور ہوتے جائیں گے۔ قوموں کے ذوق اور وجدانیت کے تصوّرات میں ردوبدل ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا لیکن اِس تمام "سلسلہ تغیرات" میں شاعری کا وہ مفہوم زندہ اور باقی رہیگا جو میں اُوپر بیان کر چکا ہوں۔ یہ مفہوم کیوں باقی رہے گا؟ اور مستقبل میں شاعری کے اِس مفہوم کے قیام کی کیا ضمانت دِی جا سکتی ہے، یہ وہ چند سوالات ہیں جو بجا طور پر کئے جا سکتے ہیں۔

اِن سوالوں کا جواب دینے کے لئے پہلے ہم کو اپنی موجودہ ترقیوں پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ اور اس کے بعد یہ طے کرنا چاہیئے کہ آیا انسان کی علمی اور فکری زندگی دن بدن ترقی کر رہی ہے یا تنزل کی طرف جا رہی ہے۔ نیز یہ کہ کیا انسان صرف اپنے احول کی پیداوار ہی ہوتا ہے یا اُس کا معمار بھی۔ اِن سوالوں کا جواب دینے کے لئے موجودہ عمرانیات پر ایک سیر حاصل تبصرہ کی ضرورت ہے۔ میں طوالت سے بچنے کے لئے اِن تمام درمیانی بحثوں کو چھوڑ رہا ہوں جو مجھے مندرجۂ ذیل نتیجہ پر پہنچاتی ہیں۔

(۱) انسان کی علمی اور فکری زندگی، تدریجی طور پر ترقی کر رہی ہے۔ زندگی اور کائنات پر اُس کا زاویۂ نظر ارتقائی ہے نہ کہ رجاعی۔ اُس نے اَب تک جو کچھ حاصل کیا ہے اور جو کچھ سیکھا ہے اُس سے زیادہ حاصل کرنے اور سیکھنے کی زبردست خواہش اِس میں موجود ہے۔

(۲) آنے والے زمانے میں ایسے افراد زیادہ پیدا ہوں گے جو ماحول کے معمار ہوں گے۔ اور ایسے لوگوں کی تعداد گھٹ جائے گی جو "صرف اپنے ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں"۔

اِن نتائج کی روشنی میں عقلِ سلیم ہرگز یہ باور کرنے کے لئے تیار نہیں کہ دنیا کے تمام علوم و فنون تو مسلسل ترقی کر رہے ہیں اور ترقی کرتے جائیں گے۔ لیکن شاعری ہی وہ آخری اور واحد فن ہوگا جو باوجود انسان کی ہمہ گیر ترقی کے دن بدن پستی میں گرتا جائے گا۔

نظری مفکرین، اس پر بھی یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ اگر انسان اَب تک ترقی کرتا رہا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ وہ آئندہ بھی ترقی کرتا رہے گا۔ ایک خاص عمل اگر متواتر اور تسلسل کے ساتھ اب تک ہوتا رہا ہے تو اس کی کوئی ضمانت نہیں کہ آئندہ بھی ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ میں اِس اِستدلال کی صحت اور جواز سے انکار نہیں کرتا۔ لیکن یہ تبلا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں صرف ایک عملی انسان کی طرح اِس مسئلہ پر بحث کر رہا ہوں۔ کسی نظری مفکر کی طرح نہیں میں سمجھتا ہوں کہ سنجیدگی اور معقولیت پسندی سے، عمرانی اور وجدانی مسائل پر غور کرنے والے ایک حد پر پہنچنے کے بعد مطمئن ہو جاتے ہیں۔ ورنہ بحث کے لئے میدان بہت وسیع ہے۔ منطقی اور سائنٹفک اصولوں کی روشنی میں یہ بحث کی جا سکتی ہے کہ "عقدِ ثریا" "رقصِ مشتری" اور "موسیقی ماہ و انجم" جو شاعری کا جزو لاینفک بن چکے ہیں، کیا علم الافلاک سے واقعی اُن کی کوئی تائید ہو سکتی ہے۔؟ یا "فریبِ تخیل" سے زیادہ اُن کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

یہاں صرف دو اشعار پیش کر کے یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ اِس قِسم کی شاعری کو کسی سوسائٹی میں بھی شاعری کے نام سے موسوم نہیں کیا جا سکتا۔

بلبلو غل نہ کرو میرا صنم سوتا ہے
تم تو اُڑ جاتے ہو وہ مجھ پہ خفا ہوتا ہے

یا یہ شعرے

اگر یُوں ہی پانی برستا رہے گا
تو گلیوں میں کاہے کو رستا رہیگا

کیا کوئی میری اِس بحث اور صحت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہے کہ ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا جب کہ اِن اشعار پر لوگ جھوم جھوم جائیں گے۔

(باقی آئندہ)

ماہر القادری

ایک شب؟ .... حاصلِ زندگانی

وہ بدمست آنکھیں وہ کافر ادائیں ‖ ختن کے ہرن، چوکڑی بھول جائیں

نگاہوں کو پہلے سے تیار کر لوں ‖ وہ پھر سامنے یک بیک آ نہ جائیں

وہ رنگین چہرہ کہ صبحِ بہاراں ‖ وہ زلفیں کہ سچ مچ برستی گھٹائیں

ادھر اک تلاطم اُدھر بیقراری ‖ شرابِ محبت پییں یا پلائیں

اسی رات پر ختم ہو بزمِ ہستی ‖ ستارے نہ اب حشر تک جھلملائیں

وہ کچھ اِس طرح جھوم کر مُسکرائے
تبسم نے ہونٹوں کی لے لیں بلائیں

مرے شوقِ بے تاب پر وہ نہ جائیں ‖ محبت کی معصوم ہیں اِلتجائیں

وہ مستی سراپا وہ نغمۂ مجسم ‖ وہ کیوں مُسکرائیں وہ کیوں گنگنائیں

مجھی پر ہے کیا منحصر وہ جو کہہ دیں
ہوائیں بھی "صبحِ بہاراں" سُنائیں

وہ ظالم ادائیں وہ کافر نگاہیں || اُلٹ دیں ذرا دیر میں خانقاہیں
نوازش نے اُن کی مجھے یہ بتایا || ابھی تک کھلی ہیں محبت کی راہیں
تڑپتی ہوئی بجلیاں تھیں کہ نظریں || لچکتی ہوئی ڈالیاں تھیں کہ باہیں
نظارے کی شدت کا عالم نہ پوچھو || نگاہیں مری ڈھونڈتی تھیں پناہیں

ہواؤں میں کس طرح گھل مل گئی تھے
مرے گرم نالے، مری سرد آہیں

شفق نے لکھا اُن کو خط غلامی || مہ و مہر اُن کی نظر کے سلامی
نگاہوں سے دو آتشہ سی پلا کر || بڑھا دی مری اور بھی تشنہ کامی
میں عرضِ تمنا ز سر تا قدم تھا || نفس بھی پیامی نظر بھی پیامی
وہ شیریں تکلم، پیا نو کا نغمہ || مبارک مجھے لذتِ ہم کلامی
وہ رفتار یا موجِ مے کی روانی || بہت ہی لطیف اور نازک جوانی
جبیں میں چراغِ تمنا فروزاں || وہ اک پیکرِ عشرتِ و شادمانی
لبوں کی پنکھاور گلوں کی نزاکت || نگاہوں کا صدقہ مے ارغوانی
نہ جانے کہاں سے صدا آ رہی تھی || محبت کی اک اک گھڑی غیر فانی

تصور کے دامن کو تھامے ہوئے ہے
وہ شب جو کہ تھی حاصلِ زندگانی

ساغر نظامی

ساغر دورِ جدید کا پیامی ہے اُس کی بہار آفریں شاعری ایک صبح نو کی تمہید ہے۔ اس کے نغمے میں ماضی کی عنایت نہیں ہے بلکہ اس رنگ محل کا انعکاس ہے سند رکلس اور برج اور گنبد مستقبل کی زرین دھوپ میں چمکتے نظر آتے ہیں

جب ساغر شباب کی تازہ اور سرخ شراب زندگی کے جام میں انڈیلتا ہے تو خود شاعری " ساقی جلوۂ دشمن و ایمان آگہی" بن کر محفل حیات میں رقص کرنے لگتی ہے۔ اس رقص جاوداں کی دل آویزیوں کو اس کی بلاخیزیوں کو رنگ محل کے ایوان خاص میں دیکھئے۔

جب ساغر بہار جوانی اور ابدیت کے گیت گاتا ہے تو اس کی شاعری کی مترنم فضا بے تہوودوں کے بہاریہ نغمے کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔ وہ جب حسن، سندرتا اور کنواریوں کی موہنی کو اپنے نغموں میں سمو دیتا ہے تو کیوپڈ کے ترکش سے اندھے تیر بے اختیار مچل کر باہر نکلتے نظر آتے ہیں۔

وہ جب اشتراکیت کے درخشندہ رنگ محل کی جلوہ آفرینیوں کو اپنے مخصوص رجائی انداز میں دکھاتا ہے تو ہمارے ذہن میں انسان کے مستقبل کی ایک ایسی واضح، روشن اور خوبصورت تصویر کھنچ جاتی ہے کہ ساری کائنات پر ایک عجیب نشہ ایک عجیب کیف اک عجب سرمستی چھانے لگتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بیک اس

مدہوش ہو کر

اس طوفان مے کی لہروں پر ناچ رہا ہے۔

رنگ محل میں ساغر نے زندگی کے پیکر نو کی تخلیق کی ہے آپ کے لاشعور کے سپنوں کو الہامی کیفیت بخشی ہے۔ ساغر نے اک ساغر نو کی تشکیل کی ہے جس کی نازک گلکاریوں کے حسین نقش رنگ محل میں دیکھئے۔ قیمت تین روپیہ بارہ آنے۔

کرشن چندر

احمد ندیم قاسمی

کی کہانیاں زندگی کے اُن بے شمار پہلوؤں کی رنگین اور صاف تصویریں ہیں۔ جو مدتوں تک اُردو افسانہ نویسوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہیں۔ یا پوشیدہ رکھی گئیں۔ اُسے نہ اخذ و اکتساب کا شوق ہے۔ اور نہ ایک ہی کہانی کو موڑ توڑ کر دوسری کہانی میں ڈھالنے کا۔ وہ ہر کہانی میں ایک نئے انداز اور ایک نرالے روپ میں آتا ہے۔ اور پڑھنے والے کو مبہوت کر دیتا ہے۔ قدیم ادب کی پاکیزگی اور جدید ادب کا خلوص اس کی تحریر میں نمایاں ہے وہ اپنے آپ کو اُن ترقی پسندوں میں شامل نہیں کرتا جو جذبات کے سیلاب میں تنکوں کی طرح بہ نکلتے ہیں۔ اس کا فن تو آبِ گرداب میں گھری ہوئی اس چٹان سے مماثلت رکھتا ہے جو چنگھاڑتی ہوئی موجوں کے تھپیڑے سہتی ہے، سب کچھ دیکھتی ہے اور خاموش رہتی ہے۔ وہ پانی کی برق رفتاری پر اپنی خاص حیثیت اور عظمت کو قربان نہیں کر سکتی۔

ندیم کے افسانوں میں کوئی چیز باہر کی نہیں۔ ہندوستان کا ایک افسانہ نگار ہندوستانیوں کی زندگی کے نقوش اُجاگر کر رہا ہے اُس کے کردار صحت مند اور مختلف النوع ہیں۔

وہ مافوق الفطرت نہیں۔ اجنبی نہیں۔ مغربی نہیں وہ زندگی کو ایک بازیگاہ سمجھتے ہیں، سوچتے ہیں، مسکراتے ہیں، روتے ہیں، لیکن اُن کے سوچنے، مسکرانے، یا رونے میں کوئی غیر فطری عنصر نہیں۔

موجودہ دور میں ندیم کے افسانے خوبصورت الفاظ۔ دلاویز پلاٹ نیز حسن فطرت، جذبات انسانی، سرمایہ و مزدور، عشق و عاشقی، اور مسائل حیات کو نہایت بے تکلفی اور معنی آفریں سلاست و گہرائی سے بیان کرنے کے لحاظ سے منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔

اقبال سلیم گاہندری

ہماری زیر طبع کتابیں

۱۔ قصص و مسائل۔ از مولانا عبدالماجد دریابادی۔

۲۔ افسانے اور ڈرامے۔ از سعادت حسن منٹو۔

۳۔ سیلاب۔ از احمد ندیم قاسمی۔

۴۔ انگڑائیاں۔ مرتبہ احمد ندیم قاسمی۔

۵۔ تقدیریں۔ از منظور بخاری۔

۶۔ اسرار۔ از علی اختر۔

۷۔ آثار اقبال۔ مرتبہ۔ عبدالقدوس ہاشمی۔

۸۔ شوکت علی۔ از رئیس احمد جعفری۔

۹۔ مقالات محمد علیؒ۔ مرتبہ رئیس احمد جعفری۔ حصہ دوم۔ سوم۔ چہارم۔

۱۰۔ مقالات جمال الدین افغانیؒ۔

۱۱۔ مارکیت۔ میر عابد علی خاں عثمانیہ۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری
ڈی۔ لٹ۔ (پیرس)

اُردو شاعری میں عورت کا تخیل

لٹریچر سوسائٹی کا آئینہ ہوتا ہے لہٰذا اُسے سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ جس زمانہ کا لٹریچر ہو اُس زمانہ کی سوسائیٹی کو بھی سمجھا جائے کیونکہ جب تک سوسائٹی کے ماحول کو نہ سمجھا جائیگا اَدب کے مزاج کو سمجھنا بہت مشکل ہے جب تک ہم یہ نہ سمجھ لیں کہ متعلقہ سوسائٹی کی معاشرت اور تمدن کیا تھا؟ اس وقت تک یہ سمجھ میں نہیں آسکتا کہ اُس زمانے کے لوگوں کے افکار وخیالات کیا تھے؟ چنانچہ اُردو شاعری کی "عورت" کو سمجھنے کے لئے ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے سماج کو سمجھیں اور یہ دیکھیں کہ اس سماج میں عورت کی حالت کیا تھی۔

بیسویں صدی کے پہلے کا اُردو اَدب زیادہ تر افسانوں اور شاعری تک محدود تھا، تقریباً سبھی شاعر اور انشا پرداز شہروں کے باشندے تھے وہ نوابوں اور رئیسوں کے دامن کرم میں پرورش پاتے تھے۔ شہروں میں بالعموم روساء اور متوسط طبقے کے لوگ رہا کرتے تھے ادنیٰ طبقے کے لوگوں میں یا تو معمولی درجے کے خدمتگار تھے یا فقیر فقراء شامل تھے نتیجہ یہ ہوا کہ اردو شاعری روساء اور امراء کی لونڈی بنی رہی؟ اب یہ دیکھنا چاہئے کہ اس طبقہ کی معاشرت کیا تھی، اور اس سوسائیٹی میں عورت کا کیا مقام تھا؟ یہ معلوم کرنے کے بعد یہ بات سمجھ میں آجائیگی کہ اُردو شاعروں کے افکار وخیالات نے کس فضا میں پرورش پائی۔

اَوراق تاریخ بتاتے ہیں کہ اس زمانہ میں عورت کی زندگی کا مقصد اس سے زیادہ اور کچھ نہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ مرد کی خواہشاتِ نفسانی کو پورا کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

ایک ایک امیر کی کئی کئی بیویاں اور لونڈیاں ہوتی تھیں اور ان کا کام اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ جس امیر سے اُن کا تعلق ہے وہ اس کی خوشنودیِ مزاج کا خیال رکھیں، چنانچہ وہ رات دن بناؤ سنگھار اور کنگھی چوٹی میں مصروف رہتی تھیں امراء کی عورتیں گھر کا کوئی کام نہ کرتی تھیں تمام گھریلو کام لونڈیاں اور باندیاں انجام دیتی تھیں اس زمانہ میں مرد عورت کو اپنی غیر منقولہ جائداد سمجھتا تھا، عورت کو کہیں گھومنے پھرنے کی اجازت نہ تھی البتہ وہ کبھی کبھی پالکی یا میانہ، ڈولی میں بیٹھ کر اپنی کسی سہیلی سے ملنے جایا کرتی تھی، مکان کے مردانے اور زنانے حصے کے بیچ میں اونچی دیوار کھینچی ہوتی تھی اور پھاٹک پر زبردست پہرہ لگا رہتا تھا مکان اکثر دو منزلہ ہوتے تھے اور اوپر کی منزل کی کھڑکیوں پر چلمن پڑی رہتی تھی عورتوں کی سخت نگرانی کی جاتی تھی، تاکنا جھاکنا تو کجا انکا ہنسنا بولنا بھی برا سمجھا جاتا تھا متوسط طبقہ کے لوگ عموماً متجردانہ اخلاق کے قائل تھے، صنفی خواہشات کی یہ روک تھام اپنی انتہائی حد تک پہنچ چکی تھی، اگر کبھی کوئی راہ چلتا نوجوان کسی دوشیزہ کو دیکھ لیتا تو اس کی دبی ہوئی نفسانی خواہشات یکایک بھڑک اٹھتیں وہ رسم و رواج کی کڑی پابندیوں کی وجہ سے باہمی میل جول کو برا سمجھتا اور عورت سے کبھی میل جول کا اتفاق نہ ہونے کی وجہ سے "عورت" اور "عیاشی" کو ایک ہی چیز سمجھتا تھا، ان نوجوانوں کو چھیڑنے کی خاطر کبھی کبھی الھڑ اور چنچل چھوکریاں چلمن کی آڑ میں آکر کھڑی ہو جاتیں اور یک نگاہ غلط انداز ڈالکر پھر چھپ جاتی تھیں ہمارے یہ نوجوان وہیں کلیجہ تھام کر بیٹھ جاتے اور نعرہ لگاتے تھے ؎

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشقِ دلگیر کو + کیسے تیرانداز ہو سیدھا تو کرلو تیر کو

آتشِ شہوت کو نہ بجھا سکنے کی وجہ سے کسی نوجوان کو جنون ہو جاتا۔ اور وہ جب کسی حسینہ کو دیکھتا تو بالکل بیتاب ہو جاتا اور اسے حاصل کرنے کے لئے لاکھوں جتن کرتا۔ عام لوگ اس بیماری کو "مرضِ عشق" کے نام سے پکارتے ہیں' جب وہ دیوانہ آپے سے باہر ہو کر اس حسینہ کے گھر میں گھسنے کی کوشش کرتا تو دربان اسے گردنیاں دیکر باہر نکال دیتا تھا۔

کوچۂ یار سے ہم ایسے نکلوائے گئے
پا بدستِ دگرے دست بدستِ دگرے

اگر غور سے دیکھا جائے تو اُردو شاعری میں شروع سے آخر تک دبے ہوئے صنفی رجحانات پائے جاتے ہیں اُردو شاعر کے سامنے سرے سے کسی شریف عورت کا نمونہ تھا ہی نہیں' وہ جن عورتوں کو دیکھتا تھا' وہ کوٹھے' ڈولی' یا نقاب میں سے للچائی ہوئی نگاہوں سے عاشقوں کے ہجوم غفیر کو دیکھنے کی عادی تھیں!! ایک اُردو شاعر کہتا ہے

؎ بن سنور کر گھر سے نکلے سیر کو جانے لگے
جب ہجوم عاشقاں دیکھا تو گھبرانے لگے

یہی وجہ ہے کہ اُردو شاعری کی "معشوقہ" کوئی شریف عورت نہیں بلکہ ایک بازاری رنڈی ہے جس کی محفل میں اغیار کا جمگھٹ لگا ہوا ہے' بیچارے "سچے عاشق" کا یہ حال ہے کہ یا تو دروازہ پر دربان اُسے چپت لگاتا اور گھسنے ہی نہیں دیتا اور اگر خوش قسمتی سے اندر جانے کا موقع ملا تو پھر اس رقیبوں سے بھری ہوئی محفل میں اُسے بیٹھنے کی جگہ ہی نہیں ملتی' اگر جگہ ملتی بھی تو وہی معشوق کی جوتیوں کے پاس کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اُوپر بام پر معشوق بال کھولے کھڑا مسکرا رہا ہے اور نیچے رقیبوں میں جوتیوں دال بٹ رہی ہے کوئی آہ سرد بھرتا ہے اور کوئی سسکیاں لیتا ہے غرض کہ ایک عجیب ہنگامہ برپا ہے۔

آپ کو اُردو شاعری میں اکثر "شامِ جوانی" کے جانے اور "صبحِ پیری" کے آنے کا ماتم بھی ملیگا! کبھی کبھی عاشق ہجر و فراق کی مصیبت جھیلتے جھیلتے اس قدر نحیف و زار ہو جاتا ہے کہ بیچارہ کھٹملوں کے ساتھ بستر کے بخیوں میں چھپ جاتا ہے۔ ؎

انتہائے لاغری سے جب نظر آیا نہ میں
ہنس کے وہ کہنے لگے بستر کو جھاڑا چاہیئے

اُردو شاعر کے نزدیک "عشق" و "ہوس" میں کوئی فرق نہیں' اس کے نزدیک عورت خواہش نفسانی کو پورا کرنیکا آلہ ہے جب وہ عیاشی کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو کہنے لگتا ہے۔ ؎

کہاں پیری کہاں کلیاں باغ جوانی کی
خزاں کا وقت ہے بیٹھے ہوئے کوّے اڑاتے ہیں

اس کے بعد روحانیت کا دور آتا ہے اکثر دیکھا گیا ہے کہ جس ملک میں خواہشات نفسانی پر کڑے پہرے بٹھا دیئے جاتے ہیں جہاں عورت پیدائشی طور پر ناپاک تصور کی جاتی ہے جہاں مرد اور عورت کا ملنا بُرا سمجھا جاتا ہے وہاں روحانیت کا بڑا زور ہوتا ہے دنیاوی خوبصورتی سے فائدہ نہ اٹھانے والے کسی خاص تخیل سے محبت کرنے لگتے ہیں اور اس چند روزہ زندگی کی فانی مسرتوں کے بدلے کسی اور دنیا کی ابدی مسرت کے خیال سے دل خوش کیا کرتے ہیں!! ایران ہندوستان اور چین میں اسی قسم کی شاعری کے سینکڑوں نمونے ملیں گے!! یہ ایک عجیب بات ہے کہ اکثر حالتوں میں جوانی ڈھلنے کے بعد ہی شاعر میں ایسے خیالات پیدا ہوتے ہیں یا اگر یہ نہ ہو تو پھر اُردو کا باکمال شاعر ادب و اخلاق کو بالائے طاق رکھ کر کچھ ایسا کھیل کھیلتا ہے کہ علمائے کرام اور صوفیوں کی محفل میں صف ماتم بچھ جاتی ہے' آخری دور کے لکھنؤ شاعر' مثلاً امانت و رشک . . . . وغیرہ اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں

امانت کہتا ہے۔ ؎

بیداد مجھے یاد ہے واللہ تمہاری
یوسف کی قسم اب نہ کروں چاہ تمہاری
للہ قدم شرم کے کوچے سے نکالو
بازار میں سب دیکھتے ہیں راہ تمہاری
عاشق کو خوشی اور رقیبوں کو الم ہو
جائے جو سواری کبھی درگاہ تمہاری

رشک کہتا ہے ؎

باغ میں جاتے ہو پہنے ہو گلابی ٹوپی
بلبلِ بے ادب آ بیٹھے نہ لے جا سر پر

اس بیہودہ شاعری کے نام لیوا اب بھی کہیں کہیں نظر آ جاتے ہیں

پردے کی ضرورت سے۔ زیادہ سخت ترین قید نے دو خوفناک بیماریاں پیدا کردیں اول رنڈیوں کی گرم بازاری، اور دوسرے حسین لڑکوں سے ناجائز محبت۔ آرٹ کی جان حسن ہے۔ آرٹ کا مفہوم و مقصد غیر فانی حُسن کی تلاش ہے جسن فی الحقیقت فطرت اور عورت کی ذات میں پنہاں ہے مگر اردو شاعر فطرت کے رنگا رنگ حسن کو دیکھنے سے اِس لئے معذور تھا کہ وہ شہر میں رہتا تھا اور فطرت کے رنگین نظارے اِس سے بہت دُور تھے، اب رہی "عورت" تو شریف "عورت" پہلے ہی گھر کی چار دیواری میں بند تھی، اُس کے حرم میں آدمی کا کیا ذکر آفتاب کی روشنی بھی نہ پہنچ سکتی اور پرندہ بھی پر نہ مار سکتا تھا اِس لئے اُردو شاعر کو جن عورتوں کو دیکھنے کا موقعہ ملا وہ زیادہ تر بازاری عورتیں تھیں یا ہرجائی معشوق تھے علاوہ بریں اُردو شاعروں نے اپنی شاعری کو غزل، و مثنوی اور اِسی طرح کے دوچار اصناف سخن سے آگے نہ بڑھنے دیا اِن غزلوں اور مثنویوں میں عشق و محبت کے چند پیش پا افتادہ خیالات اور بیوفا معشوق کے عشق میں بیکار رہائے وائے کے سوا اور کچھ بھی نہیں رکھا ہے اَب رہے قصائد تو اُن کا مقصد بعض کی کرکے دولت بٹورنے کے سوا اور کچھ نہ تھا اِس لئے اُن کے ایک بہت بڑے حصے کو شاعری کہنا خود شاعری کی توہین ہے! القصہ ہمارے اُردو شاعروں کے دامن میں حقیقی شاعری کے گلہائے رنگا رنگ خال خال نظر آتے ہیں۔

تقریباً تمام اُردو شاعر متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے یہ سب کو معلوم ہے کہ اِس طبقہ کی معاشرت کیسی ہوتی ہے؟ اِس طبقہ کی روایات رسم و رواج اور رہنے سہنے کے طریقے قریب قریب ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اِس طبقے کے لوگوں کی زندگی میں آپ ہی آپ ایک طرح کی ایک رنگی پیدا ہوجاتی ہے اُن کی زندگی میں کوئی تنوع نہیں ہوتا۔ وہ زندگی جس میں کوئی تنوع نہ ہو کتنی تکلیف دہ اور الم انگیز ہوتی ہے، روزانہ ایک ہی کام ہو رہا ہے روزانہ ایک ہی طرح کی بات کی جا رہی ہے، روزانہ ایک سی چیزیں دیکھی جا رہی ہیں، اِسی لئے اُردو شاعر کی معشوقہ "بھی" ایک گڑیا" کی حیثیت رکھتی ہے، جس کے تاؤ بھاؤ میں کوئی ندرت نہیں معلوم ہوتی، تمام شاعروں کی شاعری کا یہ مطلب نکلتا ہے کہ دربان کا خوف ہے ورنہ ابھی کمند لگا کے دیوار پھاند جائے اور دھڑام سے معشوق کے قدموں پر جا گرتے!! ؎

دیوار پھاندنے میں دیکھوگے کام میرا
جب دھم سے آکہوں گا صاحب سلام میرا

تمام شاعر بستر مرگ پر پڑے ہیں، ساری دنیا مریض غم کو دیکھنے چلی آرہی ہے گھر ماتم سرا بنا ہوا ہے! سب کو مریض عشق کی زندگی سے مایوسی ہوچکی ہے مگر ابتک عاشق کا دم اِس لئے نہیں نکلا کہ وہ اِس دُنیا سے جانے کے پہلے ایک بار معشوق کے درشن کرنا چاہتا ہے، جب معشوق کسی طرح نہیں آتا اور عاشق کی تکلیف بڑھتی چلی جاتی ہے تو ملک الموت کو اُس پر رحم آجاتا ہے چنانچہ وہ اس کی روح نکال لیتا ہے اور اس طرح اسے انتظار کے مرض سے نجات بخشتا ہے جیتے جی رقیبوں سے جو ہم بیزار ہوتی رہی حتیٰ کہ آخری وقت بھی ظالم معشوق کا دیدار نہ ہوسکا اور نتیجہ یہ نکلا کہ قبرستان پہنچ گئے اَب بیوفا معشوق آتا ہے چنانچہ وہ بال بکھرائے "گورِ غریباں" پر دیا جلانے اور فاتحہ پڑھنے پہنچتا ہے کھلی ہوئی بات ہے کہ کسی شریف خاندان کی شریف الطبع لڑکی ایسی ظالم اور بے رحم نہیں ہوسکتی تھی۔

عاشق اور معشوق زندگی کے دو حصے ہیں اُن کے ملنے ہی سے زندگی مکمل ہوتی ہے اور اس کے پہلے وہ نامکمل رہتی ہے، مگر اُردو شاعر اُسے نہیں سمجھ سکتا اس کا "معشوق" ہرجائی اور بیوفا ہے اسے سچی محبت کی کوئی قدر نہیں اور وہ اغیار کے آغوش کی زینت ہے اور سچے عاشق کو جلانا اور تڑپانا اُس کی عادت میں داخل ہے اس کی نظروں میں سچا عاشق اور ہوس پرست تماش بین دونوں برابر ہیں اُس کے نزدیک محبت کی قیمت روپیہ ہے!! اور بیچارے سچے عاشق کا یہ حال ہے کہ روپیہ تو پہلے ہی اس کے پاس نہ تھا اور اَب تو وہ دامن و گریبان بھی تار تار کرچکا ہے اِس لئے ہرجائی معشوق اُسے پوچھے بھی تو آخر کیوں پوچھے؟

چونکہ ہمارے ہاں عورت "گونگی" تھی وہ اپنے شوہر کے منہ سے

بولتی اور شوہر ہی کی آنکھوں سے دیکھتی تھی اِس لئے اُردو شاعری میں عورت کے حقیقی جذبات کا کہیں بھی پتہ نہیں چلتا' چونکہ مرد اپنے خیال کے مطابق عورت کے جذبات ظاہر کرتا ہے اِس لئے اُردو شاعری کا کیا ذکر اُردو نثر میں بھی بہت بڑی حد تک عورت کے حقیقی جذبات و احساسات کا کوئی نشان نہیں ملتا' عورت کی زندگی چہار دیواری تک محدود ہے اور یہی عورت کی دنیا ہے یہی وجہ ہے کہ آج تک مسلمانانِ ہند میں کوئی قابلِ ذکر شاعرہ یا انشاء پرداز خاتون پیدا نہ ہو سکی! جب تک ہماری سوسائٹی یہ سمجھتی رہے گی کہ مردوں اور عورتوں کے جذبات میں کوئی فرق نہیں اس وقت تک ہماری قوم میں کسی زبردست شاعرہ انشاء پرداز خاتون کا پیدا ہونا مشکل ہے۔

قدیم اُردو شاعری میں تو بے ریش و بروت لڑکوں نے عورت کا مقام چھین لیا تھا، اُردو شاعروں نے یہ نقل ایران سے اڑائی تھی ایرانی میکدوں میں حسین لڑکے ساقی گری کا کام کرتے اور رندانِ لم یزل کے عیش کا سامان بنتے تھے اُردو شاعری میں کبھی کبھی تو یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ "معشوق" کوئی عورت ہے یا لڑکا ہے؟

دوسری زبان والے اِس ٹیڑھی چال کی وجہ سے اردو شاعری پر بڑی لے دے کر رہے ہیں۔

اُردو شاعروں کا دوسرا نفرت انگیز رویہ یہ ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی معصوم لڑکیوں سے عشق بازی کرتے نظر آتے ہیں' چونکہ عورتوں کی جوانی شاعروں کی نظر سے نہیں گزرتی اِس لئے وہ اُن کے بچپن ہی کا ذکر کر کے جی بہلا لیتے ہیں ؎

بچپن میں اُن کو شوق ہوا میرے قتل کا
ننھی سی اُن کے واسطے تلوار چاہیئے

بھلا اس سے کیا توقع بزمانۂ جوانی
کبھی کم سنی میں جس نے نہ سُنی مری کہانی

جو بچپن میں یہ ضد ہے جانی تمہاری
ابھی دیکھنی ہے جوانی تمہاری

اِس مقام پر یہ کہہ دینا بیحد ضروری ہے کہ اِس قسم کی گندگی وہی شاعر اچھالتے ہیں' جنھیں خواہشاتِ نفسانی کے نکاس کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔

اصل میں اِنسانی زندگی کے دو حصے ہیں ایک بھوک اور دوسرے صنفی خواہشات' اِن دونوں کی تکمیل کے لئے ہی سوسائٹی پیدا ہوئی ہے۔

ہمارے سوشیل ریفارمروں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ذیل کی دو بیماریوں نے ہمارے سماج کو جہنم کدہ بنا دیا ہے۔

(۱) صنفی خواہشات پر بے اِنتہا دباؤ۔

(۲) صنفی تھکاوٹ۔

اِن بیماریوں پر صرف رونے دھونے سے کام نہیں چل سکتا زخم اتنا بڑھ گیا ہے کہ وہ مرہم پٹی کی حد سے گزر چکا ہے اب ضرورت ہے کہ ایسے تیز نشتر کی جو اجتماعی زندگی کے اس پھوڑے کو چیر کر فاسد مادّے کو بالکل خارج کر دے۔ بیسویں صدی کے آغاز سے اردو ادب میں اِنقلاب رونما ہے اُردو شاعر چلمن کی آڑ میں معشوق کو دیکھ کر غش کھا کر گرنا چھوڑتے چلے جا رہے ہیں' اسطرح تعلیم یافتہ عورت کی حالت بدلتی چلی جا رہی ہے اور وہ زمانہ دور نہیں جب اُردو شاعری کی "معشوقہ" عصمت باختہ بازاری عورت کا لباس چھوڑ کر ایک باعصمت اور شریف طینت دردمند خاتون کا لباس پہن لے گی۔ اصل مضمون مصنف نے ہندی میں ۱۹۴۱ء میں شائع کیا تھا۔ اُردو میں دو سال بعد چھپا

اِقدام جارحانہ

فیض جھنجھانوی

کہاں سے آئے یہ لیلئے شب میں آج اندازِ کافرانہ
یہ کہکشاں ہے کہ طاقِ نسیاں پہ سبحۂ صد ہزار دانہ

نگاہ نیچی کئے ہوئے جا رہی ہے شرمندۂ پارسائی
کھڑے ہیں گردن جھکائے زہد و ورع بہ اندازِ مجرمانہ

غضب کے خوددار بن گئے ہیں نگاہِ ساقی سے مست سجدے
سرک کر آجائے خود جبین خراب تک اُن کا آستانہ

ہر ایک غنچے کے دستِ رنگیں میں ہے چھلکتی ہوئی گلابی
ہر ایک ذرے کے عارضِ آتشیں پہ حسنِ فرنگیانہ

نسیمِ وحشت اثر میں غلطاں ہوا ہے دامانِ عقل و حکمت
فضائے سادہ میں جذبِ رنگیں خیالاتِ شاعرانہ

جو پردۂ گل میں کر رہی ہے بہارِ تبلیغ مے پرستی
تو ابر چھایا ہوا ہے گلشن پہ بن کے رحمت کا شامیانہ

یہ نرگسِ نیم باز کے مستیوں میں ڈوبے ہوئے سفینے
یہ لڑکھڑاتی ہوئی نسیمِ چمن یہ بہکا ہوا زمانہ

یہ پہلوئے گل میں فیضِ شبنم سے ایک نازک سا آبگینہ
یہ طائرِ رنگ و بو کا ہر غنچے میں گلابی سا آشیانہ

یہ آبشاروں کے دامنِ مرمریں پہ نغموں کی تابناکی
یہ دل کی گہرائیوں میں انگڑائیاں سی لیتا ہوا ترانہ

یہ عارضِ گل کہ جس میں حوروں کی مسکراتی ہوئی جوانی
یہ دورِ ساغر کہ جس کی زد میں ہے قسمتِ گردشِ زمانہ

شعاعِ مہتاب کے تبسم میں رند بادہ فروش گم ہے
وہ رند و بادہ فروش جس کی نظر بنائے شراب خانہ

وہ جس کی تاریکیوں پہ صدقے چراغِ دیر و حرم کے جلوے
وہ جس کی اک لغزشِ قدم پر نثار صد وجدِ صوفیانہ

وہ جس کی غفلت شعاریوں کے قدم پہ معراجِ ہوشیاری
وہ جس کی ٹھوکر سے سر بسجدہ غرورِ ایجادِ آذرانہ

وہ جس کا ہر ناتمام جملہ مکمل افسانۂ حقیقت
وہ جس کے ہر حرفِ زیرِ لب میں ہزار تاویل عالمانہ

وہ جس کی اک جنبشِ نظر سے ضمیرِ لوح و قلم میں لرزش
وہ جس کا ہر دقّہ تنفس جنوں کی تکمیل کا زمانہ

وہ جس کی مستی فضائے عالم پہ چھائی شعر و شباب بن کے
اسی کے ہر لفظ پر یہ چینِ جبینِ واعظ کا تازیانہ

یہ بات ہے تو ابھی سے آس کے خلاف "اِقدامِ جارحانہ"

اَفراد

جگل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (آواز میں بے نیازی ہو)
شیلا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (خوش آواز لڑکی)
گنیش ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (تعلیم یافتہ بنیا۔ بولنے کا چِچاتُلا انداز)
ایک لڑکی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (شیلا کی سہیلی)
دکاندار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (اَن پڑھ بنیا۔ جھگڑالو قسم کا آدمی)
راہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (نوکر)

"تحفہ"

(کالج کا گھنٹہ بجتا ہے ـــــ ساتھ ہی کئی قدموں کی آواز)

شیلا۔ جگل۔ جگل۔
جگل۔ اوہ ـــ شیلا؟
شیلا۔ میں تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔
جگل۔ کہو۔
شیلا۔ میں نے بہت غور کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ ہمارا آپس میں ملنا ٹھیک نہیں۔ کالج میں یا کالج سے باہر اب ہمیں ایک دوسرے سے نہیں ملنا چاہئے۔
جگل۔ کیوں؟
شیلا۔ اِس لئے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
جگل۔ کہو کہو ـــ صاف صاف کہو۔
شیلا۔ اِس لئے کہ لوگ تمہیں اول درجے کا بدمعاش آوارہ گرد اور لُچا خیال کرتے ہیں۔
جگل۔ (ہنستا ہے) صرف خیال ہی کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُنھیں اَب تک یقین ہو جانا چاہئیے تھا۔
شیلا۔ جگل تم کبھی سنجیدہ ہونا بھی سیکھو گے یا نہیں۔
جگل۔ نہیں۔
شیلا۔ کیوں۔
جگل۔ سنجیدگی میں کیا دھرا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یعنی خواہ مخواہ آدمی سنجیدہ ہوتا پھرے۔ میں صحت مند ہوں اور صحت مند رہنا چاہتا ہوں۔ اپنی زندگی کو یہ رُوگ نہیں لگانا چاہتا۔
شیلا۔ میرا فیصلہ سُن لیا۔
جگل۔ سُن لیا۔
شیلا۔ تمہیں قبول ہے؟
جگل۔ میں دوسروں کے فیصلے قبول نہیں کیا کرتا ـــ میں تم سے ملوں گا اور ملتا رہوں گا۔
شیلا۔ زندگی اَجیرن کردو گے میری۔
جگل۔ (مسکرا کر) میں تمہیں اپنی زندگی دے دونگا۔

شیلا۔ (ازراہ مذاق) جو تمہارے اِس بُوٹ کی طرح گھِسی ہوئی ہے۔

جگل۔ اِستعمال جو زیادہ کرتا رہا ہوں مگر صرف اِسکا تلا ہی گھِسا ہے۔ اُوپر کا حصہ بالکل ٹھیک ہے ـــــ پالش کر دگی تو چمک اُٹھے گا۔

شیلا۔ تم خود پالش کیوں نہیں کرتے؟

جگل۔ اِس لئے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

شیلا۔ ٹھیرو ـــــ میں اس وقت سنجیدہ ہونا چاہتی ہوں ـــــ بتاؤ تم خود پالش کیوں نہیں کرتے۔ تم اپنی اِصلاح کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ لوگ تمہیں اول درجے کا آوارہ گرد سمجھتے ہیں۔ تم اُن کے دماغ سے یہ خیال دُور کیوں نہیں کرتے۔ تم کیوں اِتنے بے پرواہ ہو ـــــ کیا تمہارا یہ لاابالی پن کبھی دُور نہیں ہوگا ـــــ کیا تم کبھی اِنسان نہیں بنوگے؟

جگل۔ آہستہ آہستہ۔

شیلا۔ لوگ میری جان کھا گئے ہیں۔ جدہر جاتی ہوں میری طرف اُنگلیاں اُٹھتی ہیں۔ میرے کیرکٹر پر حملے کئے جاتے ہیں۔ میں یہ سب کچھ سہتی ہوں۔ صرف تمہاری خاطر۔

جگل۔ میری خاطر۔

شیلا۔ بھگوان جانے میری عقل کو کیا ہوگیا ہے۔ مجھے تم سے اِتنا اُنس کیوں پیدا ہوگیا ہے ـــــ میں تم سے بالکل کنارہ کش ہو جاتی۔ تمہارے خیال تک کو اپنے دل و دماغ سے محو کر دیتی مگر مجھے ترس آتا ہے کہ تم اور بھی زیادہ بہک جاؤ گے۔

جگل۔ تم مجھ پر ترس کھاتی ہو ـــــ میں کوئی زخمی گدھا نہیں۔ کوئی لنگڑاتا ہنس نہیں ـــــ کوئی بیمار بھینس نہیں۔

شیلا۔ (ذرا دُرشتی کے ساتھ) جگل۔

جگل۔ بکو نہیں۔

شیلا۔ (دھیمے لہجے میں۔ اَفسردگی کے ساتھ) جگل۔

جگل۔ جگل اوّل درجے کا بدمعاش۔ شہدا۔ لُچا اور آوارہ گرد ہے۔

شیلا۔ میں نے یہ کبھی نہیں سمجھا۔

جگل۔ وہ اپنے بالوں میں تیل نہیں لگاتا۔ میلے کپڑے پہنتا ہے۔ اُس کا جوتا پھٹا ہوا ہے۔

شیلا۔ میں نے یہ کبھی نہیں کہا۔

جگل۔ پہلے نہیں کہا تو اَب کہہ لو ـــــ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے نفرت کرو ـــــ ابھی۔ اِسی وقت ـــــ میں چاہتا ہوں کہ تمہاری عقل درست ہو جائے اور وہ رتی بھر اُنس جو تمہارے دل میں پیدا ہوگیا ہے دُور ہو جائے۔ تم مجھ سے بالکل کنارہ کش ہو جاؤ تاکہ میں اور زیادہ بہک سکوں۔

شیلا۔ تم کتنے بے رحم ہو۔

جگل۔ لوگ تمہاری جان کھا گئے ہیں۔ جدہر جاتی ہو تمہاری طرف اُنگلیاں اُٹھتی ہیں۔ تمہارے کیرکٹر پر حملے کئے جاتے ہیں ـــــ صرف میری خاطر ـــــ مجھ شہدے لُچے اور آوارہ گرد کی خاطر ـــــ تمہارا فیصلہ اَب مجھے منظور ہے اِس لئے کہ تم مجھ پر بیکار ترس کھاتی رہی ہو ـــــ طبیعت پر جبر کر کے مجھ پر رحم کرتی رہی ہو۔

شیلا۔ تم بہت جلد بھڑک اُٹھتے ہو جگل۔ مجھے تم سے جھوٹ موٹ کا اُنس نہیں ہے ـــــ میری ہمدردی مصنوعی ہمدردی نہیں ـــــ میں تم پر ترس کھاتی ہوں اِس لئے کہ دوسرے تم پر ترس نہیں کھاتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ تم اور زیادہ بہک جاؤ۔ تمہارا وجود بالکل منتشر ہو جائے۔ تمہارے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ اِس طور پر کہ تم پھر اُنھیں اکٹھا نہ کر سکو ـــــ میں یہ نہیں چاہتی۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ میں عورت ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم سلامت رہو۔ وہ تمام خوبیاں جو

لوگوں کے نزدیک تمہارے اندر نہیں پیدا ہو جائیں —— میں بڑے فخر کے ساتھ کہہ سکوں —— جگل صاحب میرے دوست ہیں۔

جگل۔ (تمسخر آمیز ہنسی) جگل صاحب —— یہ جگل صاحب ہیں۔ شہر کے بہت بڑے رئیس —— بہت بڑا نام ہے آپ کا۔ آپ کی پتلون میں چار پیوند لگے ہیں کوٹ آپنے کسی دوست کا پہن رکھا ہے۔ جوتا آپ کا پھٹا ہوا ہے (ہنستا ہے) یہ جگل صاحب ہیں (ہنستا ہے) جاؤ۔ شیلا۔ جاؤ —— ایک ناکارہ آدمی میں اتنی دلچسپی نہ لو —— پڑھو۔ امتحان پاس کرو اور شادی وادی کرکے اطمینان سے ایک جگہ بیٹھ جاؤ۔

"شادی وادی" کے ساتھ ہی شہنائیوں کا ریکارڈ لگا دیا جائے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہجوم کا شور پیدا کیا جائے —— چند لمحات کے بعد ان آوازوں کو دھیما کر دیا جائے اور ذیل کا مکالمہ سپر امپوزم کیا جائے)

ایک آدمی۔ کیا ہو رہا ہے بھائی یہاں؟

دوسرا آدمی۔ شادی بیاہ ہو رہا ہے۔

جگل۔ کس کا۔

پہلا آدمی۔ تم نہیں جانتے۔

جگل۔ مجھے کیا معلوم؟

پہلا آدمی۔ رائے بہادر شیام سندر جی کی سپتری شیلا کا بیاہ ہو رہا ہے۔

جگل۔ کس کے ساتھ؟

پہلا آدمی۔ رائے صاحب لالہ گنیش پرشاد جی کے ساتھ۔ شہر کے بہت بڑے رئیس ہیں۔ لاکھوں میں کھیلتے ہیں۔

جگل۔ ضرور کھیلتے ہوں گے —— سگرٹ کا ایک کش مجھے بھی دینا۔

پہلا آدمی۔ نیا لیلو۔

جگل۔ نہیں نہیں۔ یہی دے دو۔ تم نیا سلگا لو (ہنستا ہے) سلگے سلگائے سگرٹ مجھے اچھے لگتے ہیں اس لئے کہ سلگانے نہیں پڑتے۔

(شہنائیوں کی آواز بلند ہو کر پھر عقب میں چلی جائے۔)

جگل۔ بڑا جمگھٹ لگا ہے۔

پہلا آدمی۔ برات آ چکی ہے۔

جگل۔ چلی بھی جائے گی۔

پہلا آدمی۔ (ہنستا ہے) تو کیا یہیں بیٹھی رہیگی کیسی باتیں کرتے ہو یار۔

جگل۔ (ہنستا ہے) بس ایسی باتیں ہی کیا کرتا ہوں۔

دوسرا آدمی۔ یہ لڑکی کسے ڈھونڈ رہی ہے؟

جگل۔ جانے بلا۔

پہلا آدمی۔ تمہاری طرف دیکھ رہی ہے۔

جگل۔ میری طرف ....؟ (ہنستا ہے) لیکن میں تو شادی نہیں کرنا چاہتا۔

(تینوں ہنستے ہیں)

لڑکی۔ آپ میں سے کس کا نام جگل ہے۔

پہلا آدمی۔ میرا تو نہیں ہے۔ اس سے پوچھ لو۔

لڑکی۔ (جگل سے) کیا جگل صاحب —— آپ ہیں۔

جگل۔ صاحب کوئی اور ہوگا۔ میں صرف جگل ہوں۔

لڑکی۔ چلئے —— آپ کو اندر بلایا ہے۔

جگل۔ کس نے؟

لڑکی۔ آپ چلئے میں بتاتی ہوں۔

جگل۔ کیا میرا چلنا ضروری ہے ——

لڑکی۔ جی ہاں۔

جگل۔ (اپنے ساتھیوں سے) اچھا بھئی تو رخصت چاہتا ہوں۔ سگرٹ کا شکریہ۔

پہلا آدمی۔ (ازراہِ مذاق) ایک اور لیتے جاؤ۔ شاید آندر ضرورت پڑے۔

جگل۔ (ہنستا ہے) نہیں پڑے گی۔

شہنائیوں اور ہجوم کا شور عقب سے ابھر آئے اور چند لمحات کے بعد دب جائے۔

جگل۔ آپ نے مجھے بلایا ——— فرمایئے؟

شیلا۔ (اضطراب بھرے لہجے میں) تم نے — تم نے مجھے آپ کیوں کہا؟

جگل۔ دیر کے بعد ملاقات ہوئی اس لئے یہ اجنبیت پیدا ہو گئی۔

شیلا۔ تم ابھی تک ویسے کے ویسے ہو۔

جگل۔ جی ہاں ابھی تک ویسے کا ویسا ہوں۔ کیا جناب کو اس پر کوئی اعتراض ہے۔

شیلا۔ (اور زیادہ مضطرب ہو کر) یہ آداب کس لئے

جگل۔ آپ کے شاندار لباس سے مرعوب ہو گیا ہوں

شیلا۔ (تنگ آ کر) آہ۔ تم مجھے دیوانہ بنا دو گے مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے۔ میں نے تمہیں یہاں اس لئے بلایا تھا کہ میں تم سے بیشمار باتیں کرنا چاہتی تھی مگر اب مجھے ایک بھی یاد نہیں آتی۔ تمہارے اس عجیب و غریب لہجے نے مجھے سب کچھ بھلا دیا ہے ——— بتاؤ مجھے کیا کہنا تھا؟

جگل۔ مجھے کیا معلوم؟

شیلا۔ تمہیں سب کچھ معلوم ہے۔ تم سب کچھ جانتے ہو — جلدی کرو۔ میرے پاس بہت تھوڑا وقت ہے — بتاؤ — بتاؤ میں تم سے کیا کہنا چاہتی تھی — بتاتے کیوں نہیں؟

جگل۔ مجھے کیا معلوم۔

شیلا۔ تم — تم — تمہاری صحت کیسی ہے؟ — تم بہت دبلے ہو گئے ہو ——— میں۔ میں بالکل اچھی ہوں۔ لیکن تم ...... (تنگ آ کر) نہیں — میں کچھ اور ہی پوچھنا چاہتی تھی (باہر سے کسی عورت کی آواز آتی ہے۔ "شیلا") ...... دیکھا ...... وقت ہو گیا ——— تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا — اور مجھے بے شمار باتیں کہنا تھیں

جگل۔ تمہاری شادی ہو رہی ہے۔

شیلا۔ ہاں — ہاں — مجھے تم سے یہ بھی کہنا تھا۔

(دستک ہوتی ہے)

شیلا۔ (بلند آواز میں) ٹھیرو ...... (جگل سے) کچھ اور بھی کہو۔

جگل۔ کیا کہوں۔

(دستک ہوتی ہے)

شیلا۔ آئی — توبہ — دستک دے دے کر دروازہ توڑ دیا ہے (جگل سے) جگل۔ اب تم جاؤ۔ کیا کروں مجبوری ہے — لیکن دیکھو۔ کبھی کبھی مجھ سے ملنے کے لئے ضرور آیا کرنا ——— ضرور ... ضرور ... ادھر سے

(دروازہ کھولنے کی آواز)

شیلا۔ مجھے بھولنا مت — سنتے ہو۔ مجھے بھول نہ جانا۔

شہنائیوں اور ہجوم کی آواز ابھر کر اونچی ہو جاتی ہے۔ چند لمحات کے بعد فیڈ آؤٹ۔

گنیش۔ شیلا۔

شیلا۔ جی۔

گنیش۔ تمہارے البم میں یہ تصویر کس کی ہے؟

شیلا۔ ٹھیریئے۔ میں آکے بتاتی ہوں۔

(قدموں کی آواز)

شیلا۔ یہ ؟
گنیش۔ کس کی ہے ؟
شیلا۔ جگل صاحب کی۔
گنیش۔ وہ کون۔
شیلا۔ آپ نہیں جانتے —— کالج میں یہ ہمارے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔
گنیش۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے اُس شخص کو کہیں دیکھا ہے۔
شیلا۔ دیکھا ہوگا۔
گنیش۔ مجھے یاد آیا —— تمہاری شادی ہی پر تو کہیں دیکھا تھا —— مگر۔ ۔ ۔ ۔
شیلا۔ کوئی اور ہوگا۔
گنیش۔ ہو سکتا ہے مگر میں نے اُسے اچھی طرح دیکھا تھا اس لئے کہ اُس کا لباس اور اُس کی وضع قطع ۔ ۔ ۔
(گھڑی چار بجاتی ہے)
شیلا۔ لیجئے چار بج گئے —— اب کیا خاک تیاری ہوگی۔ مجھ سے اور ہمیں ٹھیک پانچ بجے وہاں پہنچنا ہے —— البم کو چھوڑیئے اور موٹر نکلوانے کے لئے کہیئے۔
گنیش۔ تمہیں ساڑھی تبدیل کرنا تھی۔
شیلا۔ یہی ٹھیک ہے —— ساڑھی تبدیل کروں گی تو ساری چیزیں بدلنا پڑیں گی —— نیا بلاؤز۔ نیا پیٹی کوٹ اور پھر یہ سینڈل بھی تو اتارنا پڑے گی —— یہی ٹھیک ہے۔
گنیش۔ لیکن اتنی جلدی کیا ہے۔
شیلا۔ واہ —— مجھے راستے میں اپنی ایک دو سہیلیوں سے بھی تو ملنا ہے —— چلئے —— چلئے۔
(قدموں کی چاپ۔ بعد میں موٹر کی آواز)

ایک دم ہجوم کا شور سُنائی دیتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ لڑ جھگڑ رہے ہیں شور کے اس ٹکڑے پر ذیل کا مکالمہ سپر امپوز کیا جائے۔

دکاندار۔ نہیں صاحب میں اِسے کبھی نہیں چھوڑونگا ایسے ہزاروں گھِسّے مجھے دے چکا ہے۔
ایک آدمی۔ ایک بار اور دیکھ لو۔
دکاندار۔ کیا دیکھ لوں —— اب کا گیا چھ مہینے اپنی شکل نہیں دکھائے گا —— یہ تو اتفاق سے آج میری نظر پڑ گئی ورنہ کبھی ہاتھ نہ آتا۔
دوسرا آدمی۔ تو اب تم کیا کرنا چاہتے ہو۔
دکاندار۔ پکڑ کر تھانے لے جاؤں گا اور کیا کھڑا سالے کا مُنہ دیکھتا رہوں گا۔
(موٹر کے ہارن کی آواز)
دکاندار۔ آپ لوگ جائیے —— کیا کوئی تماشا ہے۔
تیسرا آدمی۔ تماشا ہی تو ہے۔ تم اُس سے اپنے روپئے مانگتے ہو۔ یہ کہتا ہے میرے پاس نہیں ہیں۔ تم کہتے ہو۔ نہیں میں نہیں مانتا۔ تمہارے پاس ہوں نہ ہوں ابھی نکال کر دو۔
(بہت سے آدمی ہنستے ہیں)
دکاندار۔ تو کیا کروں —— پھر بھاگ جائیگا —— کیا ساری عمر اسی کو ڈھونڈتا رہوں گا۔
پہلا آدمی۔ ارے بھئی تم نے کیوں قرض لیا تھا اَب دیکھو کتنی خفت اُٹھانی پڑ رہی ہے تمہیں۔
(موٹر کے ہارن کی آواز)
دوسرا آدمی۔ بھئی راستے سے تو ہٹ جاؤ۔
دوکاندار۔ آپ لوگ ہٹ جائیں۔ میں تو یہیں کھڑا رہونگا اِس کا گریبان پکڑے۔
تیسرا آدمی۔ یہ کیسا آدمی ہے۔ خود کچھ بولتا ہی نہیں۔
دکاندار۔ کیا بولے گا —— روپیے دینا ہے

اور ہر حالت میں دینا ہے۔

(موٹر کے ہارن کی آواز۔ بالکل قریب)

گنیش۔ راستے سے ہٹو گے یا موٹر اوپر چڑھا دوں —— بازار کے عین بیچ میں تماشا لگا رکھا ہے۔

(ہجوم کا شور)

شیلا۔ (گھبرا کر) چلیئے۔ اب راستہ صاف ہو گیا ہے۔

گنیش۔ ٹھیرو ...... (بلند آواز میں) اے —— ذرا ادھر آؤ۔

دکاندار۔ مجھے بلایا ہے سیٹھ صاحب۔

گنیش۔ کیا بات ہے؟

دکاندار۔ روپیے دینا ہے سیٹھ صاحب۔ چھ مہینے ہو گئے ہیں۔ برابر مجھے گھسیٹے دیئے چلا جا رہا ہے۔ آج دیتا ہوں۔ کل دیتا ہوں۔ بس اسی طرح چھ مہینے گذر گئے ہیں

گنیش۔ کتنی رقم نکلتی ہے تمہاری اس کی طرف۔

دکاندار۔ سوا نو روپیہ سیٹھ صاحب۔

گنیش۔ بس ....! (وقفہ) لو یہ دس روپیہ کا نوٹ ہے۔

شیلا۔ (اضطراب بھرے لہجے میں) آپ کیوں کسی کا قرض ادا کرتے ہیں —— وہ خود ادا کرے۔

گنیش۔ کہاں سے ادا کرے گا .... (دکاندار سے) سوا نو روپیے کہے تھے نا تم نے۔

دکاندار۔ جی ہاں۔

گنیش۔ بارہ آنے بچیں گے۔ یہ تم اسے دے دینا۔

شیلا۔ (قریب قریب چیخ کر) آپ نوٹ واپس لے لیجئے —— آپ زبردستی بھیک دے رہے ہیں:

(موٹر اسٹارٹ ہوتی ہے اور چل پڑتی ہے)

پہلا آدمی۔ یہ کون تھے؟

جگل۔ (زہر خند کے ساتھ) تم نہیں جانتے یہ کون تھے —— یہ شہر کے بہت بڑے رئیس تھے۔ رائے صاحب لالہ گنیش پرشاد —— لاکھوں میں کھیلتے ہیں —— تم نے دیکھا نہیں تھا کہ ان کی پتلون میں ایک بھی پیوند نہیں تھا —— کوٹ ان کا اپنا تھا —— جوتا بالکل نیا تھا ....

دکاندار۔ لو یہ بارہ آنے۔

جگل۔ لاؤ —— میری جیب بالکل خالی تھی۔

(ہجوم کا شور —— چند لمحات کے بعد فیڈ آپ)

آہستہ آہستہ ذیل کی غزل کی دھن شروع ہو —— سازوں پر۔ پھر شعر گائے جائیں۔

غزل

غم کی دنیا بسا رہی ہوں میں
ان کو اپنا بنا رہی ہوں میں
سازِ ہستی کے تار ٹوٹ نہ جائیں
نغمۂ دل سنا رہی ہوں میں
سعیٔ ناکام کے چراغوں کو
آندھیوں میں جلا رہی ہوں میں

(چند لمحات تک ساز دردناک لے میں بجتے رہیں۔)

گنیش۔ شیلا۔

شیلا۔ (افسردگی کے ساتھ) جی۔

گنیش۔ تمہارے البم سے وہ تصویر کہاں گئی۔

شیلا۔ وہ جو آپ نے اس روز دیکھی تھی۔

گنیش۔ ہاں۔ وہی۔

شیلا۔ نکال دی ہے۔

گنیش۔ کیوں ...... بڑی اچھی تصویر تھی۔

شیلا۔ (لہجے میں دبے ہوئے صدمے کے

آثار نظر آتے ہیں) اچھی ہی تھی۔
گنیش۔ تو نکال کیوں پھینکی۔
شیلا۔ نکالی ہے۔ پھینکی نہیں۔
گنیش۔ میرا مطلب یہی تھا۔
شیلا۔ اچھا۔
گنیش۔ تمہاری طبیعت کئی دنوں سے سست سی ہے۔ —— غالباً اُسی دن سے جب ہم موٹر میں باہر گئے تھے۔
شیلا۔ جی ہاں۔ اُسی دن سے سست ہے۔ ہوا لگ گئی تھی۔
گنیش۔ مجھے یاد آیا۔ اُس روز واقعی ہوا بہت تیز تھی۔
شیلا۔ سرد بھی۔
گنیش۔ سرد بھی۔ . . . . یہ ہوا بعض اوقات بہت تیز اور سرد ہو جاتی ہے۔
شیلا۔ جی ہاں۔
گنیش۔ شیلا۔ اپنے اس دوست کی کچھ باتیں تو سناؤ۔ تمہاری طبیعت بہل جائے گی۔
شیلا۔ کیا سناؤں۔
گنیش۔ کچھ بھی —— تصویر سے آدمی دلچسپ معلوم ہوتا تھا —— کیا نام بتایا تھا۔
شیلا۔ جنگل صاحب۔
گنیش۔ جنگل صاحب (صاحب پر زور دے کر) آپ کی کوئی خاص خوبی۔
شیلا۔ آوارہ مزاجی۔
گنیش۔ (ہنستا ہے) مذاق کرتی ہو۔
شیلا۔ (انتہائی سنجیدگی کے ساتھ) مذاق نہیں کرتی۔ جنگل صاحب کی سب سے بڑی خوبی اُن کی آوارہ مزاجی ہے۔ اُن کا لاابالی پن۔
گنیش۔ تو وہ ایک نہیں کئی خوبیوں کے مالک ہیں

شیلا۔ جی ہاں —— وہ بے حد مفلس —— انتہا درجے کے غلاظت پسند۔ بدتمیز ادب آداب سے ناواقف (آواز گلوگیر ہو جاتی ہے) بدزبان اور ذلت پسند ہیں۔
گنیش۔ تم صریحاً مذاق کر رہی ہو۔ میں ہرگز ماننے کے لئے تیار نہیں۔
شیلا۔ (تلخ لہجے میں) مذاق آپ کر رہے ہیں
گنیش۔ تمہاری سالگرہ کی خوشی میں آج شام کو ایک دعوت کر رہا ہوں۔ تم جنگل صاحب کو بلاؤ۔ میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔
شیلا۔ (ایک دم بھڑک اُٹھتی ہے) بس۔ بس —— اب آپ میری آتما کو زیادہ دکھ نہ دیجئے۔ بہت زہریلی سوئیاں آپ مجھے چبھو چکے . . . . . . (روتی آواز میں) جی بھر کے آپ نے مجھے ذلیل کر لیا — کیا ابھی تک کلیجہ ٹھنڈا نہیں ہوا . . . . . . جو کچھ آپ کہنا چاہتے تھے۔ میں نے کہہ دیا ہے —— آپ نے کہلوا لیا ہے —— اب آپ اور کیا چاہتے ہیں۔ وہ بدمعاش ہے۔ لچا ہے۔ آوارہ گرد ہے۔ انسانیت کے دامن پر بدنما دھبا ہے —— قابل نفرت انسان ہے —— کچھ اور کہوں یا اتنا ہی کافی ہے . . . . .
گنیش۔ (اچھے تلے انداز میں) اتنا کافی نہیں ہے۔ آج شام کو وہ دعوت میں ضرور شریک ہوں گے۔
شیلا۔ میں اُسے ہرگز نہیں بلاؤں گی۔
گنیش۔ مجھے معلوم تھا۔ اسی لئے میں نے خود اُن سے آنے کو کہا اور انھوں نے کمال عنایت سے میری درخواست قبول کر لی ہے۔
شیلا۔ (سخت گھبراہٹ کے ساتھ) وہ آئیگا —— نہیں۔ نہیں —— وہ کبھی نہیں آئے گا —— اگر وہ آئے گا تو آپ مجھے موجود نہ پائے گا۔

گنیش۔ میں اِس کا انتظام بھی کروں گا (ہنستا ہے)
.... آج شام کو پانچ بجے تم دونوں دعوت میں شریک ہوگے ——

گھڑیال کے الارم کی خرخراہٹ۔ پانچ بجنے کی آواز اور ساتھ ہی ہجوم کا شور۔

ایک مہمان۔ رائے صاحب۔ بڑے ٹھاٹ کی دعوت کی ہے۔

گنیش۔ لالہ جی۔ شیلا کی سالگرہ ہو اور یہ ٹھاٹ۔ نہ کیئے جائیں (مسکرا کر) کیوں شیلا؟

شیلا۔ اتنا اہتمام صرف آپ ہی کر سکتے تھے۔

گنیش۔ (مسکرا کر) صرف تمہاری خاطر۔

دوسرا مہمان۔ رائے صاحب —— اب کس کا انتظار ہے۔ دعوت شروع ہو۔

گنیش۔ سب مہمان آچکے ہیں۔ سوائے ایک کے اُن کے بغیر پروگرام شروع نہیں ہوسکتا۔

دوسرا مہمان۔ کون ہیں یہ مہاشے؟

گنیش۔ شیلا کے کالج کے زمانے کے دوست —— جگل صاحب —— ابھی تک آئے نہیں شیلا؟

شیلا۔ آہی جائیں گے۔

(موٹر کے ہارن کی آواز)

تیسرا مہمان۔ یہ کون آیا؟

دوسرا مہمان۔ آگے بڑھ کے دیکھ لو۔

(قدموں کی آواز)

تیسرا مہمان۔ بڑی شاندار موٹر ہے۔

چوتھا۔ بالکل نیا ماڈل۔

تیسرا مہمان۔ آج کل تو بہت زیادہ قیمت ہوگی۔ اس کی۔

(قدموں کی آواز)

رامو۔ سرکار۔ جگل صاحب تشریف لائے ہیں۔

گنیش آگئے۔

رامو۔ ہاں سرکار آگئے۔

گنیش۔ انھیں اندر لے آؤ رامو۔

(قدموں کی آواز ... ما کرو فون کی طرف)

گنیش۔ (حیرت کے ساتھ) یہ کون ہے؟

(قدموں کی آواز قریب تر آجاتی ہے)

جگل۔ (با وقار۔ شگفتہ اور با تمیز لہجے میں) اگر ناگوارِ خاطر نہ ہو تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ میں سے کون صاحب خانہ ہیں۔

شیلا۔ جگل .... تم .... تم ......؟

جگل۔ اوہ ...... شیلا ...... بھئی پہلے مجھے اپنے پتی سے متعارف کراؤ جنھوں نے مجھے یہاں مدعو کیا۔

گنیش۔ میں ...... میں حاضر ہوں۔

جگل۔ پہلے آپ میرا شکریہ قبول کیجئے کہ آپ نے مجھے اس شاندار دعوت میں شریک کیا۔ آپ نے جو آدمی میرے پاس بھیجا تھا میں نے اُس سے کہہ دیا تھا کہ بحد مصروف ہونے کے باوجود میں ضرور آؤں گا۔

شیلا۔ تمہارے رائے صاحب بڑے ہی اچھے آدمی ہیں تم بہت خوش نصیب ہو ...... کیوں جناب۔ میں غلط کہہ رہا ہوں۔

گنیش۔ (چونک کر) کیا کہا آپ نے۔

جگل۔ (ہنستا ہے) حد ہوگئی بے ...... شیلا۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ تمہاری شادی ہوچکی ہے — دراصل۔ جائداد کے انتظام اور دوسرے کاموں میں اس قدر مشغول ہوا کہ سب کچھ بھول گیا (ہنستا ہے) دولت کمانا اور اس کو سنبھالنا بہت بڑی دردسری ہے۔ —— تمہاری صحت تو اب پہلے سے بہت اچھی ہے۔

شیلا۔ (خاموش رہتی ہے)

جگل۔ رائے صاحب۔ یہ آپ نے شیلا کو کیا کردیا ہے

کچھ بولتی ہی نہیں ——— بالکل گونگی ہو گئی ہے —
اور آپ . . . . . .

گنیش۔ میں ——— میں . . . . . !

جگل۔ جی ہاں۔ آپ کیا سوچ رہے ہیں ——
ذرا ہنگامہ شروع ہو ——— میرے پاس وقت بہت
کم ہے۔ جو پروگرام آپ نے بنایا ہے بس اب شروع ہو جائے
——— ہاں بھئی شیلا ——— میں تمہارے لئے ایک
تحفہ لایا ہوں۔

شیلا۔ (مُردہ آواز میں) تحفہ۔

جگل۔ میرا خیال ہے کہ میں تمہارے لئے ایک تحفہ
لایا ہوں ——— رائے صاحب اب پروگرام شروع
کیوں نہیں کرتے ——— اب کیا دیر ہے۔

(مکمل خاموشی)

جگل۔ یہ خاموشی کیوں؟

(وقفہ)

جگل۔ آپ نہیں شروع کرتے تو لیجئے۔ میں شروع
کرتا ہوں (بلند آواز میں لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا
ہے) حضرات سنیئے۔

(ہجوم کی سرگوشیاں)

جگل۔ (تقریر کے انداز میں) رائے صاحب
لالہ گنیش پرشاد جی نے آپ کو ایک بندر کا تماشا دکھانے
کا انتظام کیا تھا لیکن افسوس ہے کہ وہ بندر نہیں آیا
——— اس کے بدلے میں آگیا . . . .

(ہجوم کی سرگوشیاں)

جگل۔ جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ میں بندر
نہیں ہوں۔ خوش پوش انسان ہوں۔ آپ نے میرا
لباس یقیناً پسند کیا ہوگا۔ وہ موٹر کار بھی پسند کی ہوگی
جو ابھی تک باہر کھڑی ہے ——— میری گفتگو بھی آپ
کو ضرور بہائی ہوگی . . . . یہ میری سونے کی گھڑی
. . . . یہ ہیرے کی انگوٹھی بہت قیمتی ہے ——— لیکن
آپ کی نگاہوں نے تو میری ہر چیز کو تول لیا ہوگا اور اسکی
قیمت بھی مقرر کر لی ہوگی (لہجے میں طنز پیدا ہو جاتا ہے)
آپ سب شریف آدمی ہیں . . . . میں ——— میں بھی
شریف آدمی ہوں اس لئے کہ میرا لباس اچھا ہے۔ میری
موٹر اچھی ہے۔ میری انگوٹھی اچھی ہے۔

گنیش۔ مسٹر جگل۔

جگل۔ خاموش۔ رائے صاحب۔ خاموش۔ جب
ایک شریف آدمی بات کر رہا ہو تو اُسے بیچ میں نہیں ٹوکنا
چاہیئے ——— یہ گنوارپن ہے۔ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں
اور میرے پاس وقت بہت تھوڑا ہے۔ مجھے ایک
بہت ضروری کام پر جانا ہے ——— میں آوارہ گرد
تھا۔ بدمعاش اور رذیل انسان نہیں ہوں۔ اس لئے
کہ میں مفلس نہیں۔ میرے پاس بے شمار دولت ہے
(ہنستا ہے) بیشمار دولت۔ اتنی کہ مجھ سے سنبھالے
نہیں سنبھلتی ——— دولت بڑی اچھی چیز ہے۔ یہ نہ
ہو تو آپ کیا ہیں . . . . . محض بندر۔

(ہجوم کا شور)

جگل۔ خاموش . . . . . اگر دولت نہ ہوتی تو
آپ سب بندر ہوتے۔ لوگ ڈگڈگیاں بجا کر آپ کو
نچاتے ——— آپ کے دماغوں میں بھُس بھرا ہے
لیکن آپ عقلمند ہیں۔ صرف دولت کی وجہ سے —
آپ بدشکل ہیں۔ آپ کی توندیں اُبھری ہوئی ہیں لیکن
آپ خوبصورت ہیں۔ خوبصورت بیویوں کے شوہر
ہیں۔ اس لئے کہ آپ دولت مند ہیں ——— آپ
بھری محفل میں ڈکاریں لیں۔ میز پہ ننگی ٹانگیں رکھ کر
بیٹھ جائیں۔ جمائیوں پر جمائیاں لیں۔ لیکن آپ کو
کوئی بدتمیز نہیں کہے گا ——— آپ بڈھے ہو کر
جوان ہو سکتے ہیں لیکن جن کے پاس دولت نہیں
وہ جوانی میں بھی جوان نہیں ہو سکتے ——— دولت
عجیب و غریب چیز ہے ——— آپ اپنی منحوس اور

بھیانک شکل کی تعریف میں شاعروں سے قصیدے لکھوا سکتے ہیں ــــ بڑے بڑے آرٹسٹوں سے اپنی تصویر بنوا سکتے ہیں۔ خوبصورت عورتوں سے رومال لڑا سکتے ہیں۔ ــــ دولت عجیب وغریب چیز ہے (ہنستا ہے) دولت عجیب وغریب چیز ہے۔ (ہنستا ہے) میں بھی دولت مند ہوں ــــ بہت بڑا دولت مند (دیوانہ وار ہنستا ہے ــــ ہنستے ہنستے آخر میں آواز بالکل کمزور مُردہ ہو جاتی ہے) بہت بڑا دولت مند۔

شیلا۔ (ایک دم چیخ کر) جگل ... جگل

(جگل کے گرنے کی آواز۔ ہجوم کا شور۔)

شیلا۔ (بھاگ کر جگل کے پاس جاتی ہے۔)

جگل ــــ جگل ــــ یہ کیا ہو گیا تمہیں ــــ گر کیوں پڑے ــــ سُنتے ہو؟

جگل۔ (کمزور آواز میں کمزور ہنسی کے ساتھ) میں بہت بڑا دولت مند ہوں ــــ بہت بڑا ــ آٹھ روز سے میں نے کچھ نہیں کھایا اور دو مہینے سے بیمار ہوں ــــ رائے صاحب۔ آٹھ روز سے میں نے کچھ نہیں کھایا۔ کہاں ہیں رائے صاحب ــــ

شیلا۔ (گلوگیر آواز میں) جگل ...

جگل۔ شیلا۔ جگل نہیں۔ جگل صاحب کہو ــ ان لوگوں سے فخر کے ساتھ کہو کہ یہ جگل صاحب ہیں ــــ میرے دوست ــــ ان کی پتلون اپنی نہیں کوٹ۔ قمیص۔ ٹائی۔ جوتا۔ انگوٹھی۔ گھڑی ــــ ان میں سے کوئی چیز بھی ان کی اپنی نہیں ــــ یہ سب چیزیں اس کی ہیں جو نیچے اپنی موٹر میں میرا لباس پہنے بندھا پڑا ہے ــــ بتاؤ کون گدھا ہے ــــ لیکن ہے دولت مند (ہنستا ہے)

شیلا۔ یہ تم نے کیا کیا جگل۔

جگل۔ (مسکرا کر) ایک تماشے کے بدلے دوسرا تماشا) ــــ کیا میں اس لباس میں شریف اور مہذب انسان دکھائی نہیں دیتا ــ کیا ہوا جو مجھے آٹھ روز سے کھانے کو نہیں ملا ــــ کیا ہوا اگر ضعف کے باعث میری زندگی ختم ہو رہی ہے ــــ کیا ہوا ــــ ایک آوارہ گرد کم ہو جائے گا ــــ ایک ناکارہ انسان یہاں سے دفع ہو جائے گا ... اچھا شیلا میں اب جاتا ہوں۔

شیلا۔ کہاں۔

جگل۔ موت نے بلا بھیجا ہے ــــ وہاں بھی شاید ایسی ہی دعوت ہوگی۔

شیلا۔ (گلوگیر آواز میں) میرا تحفہ۔

جگل۔ تمہارا تحفہ ــــ ہاں تمہارا تحفہ ــــ میرا سب کچھ تو نیچے موٹر میں پڑا ہے ــــ (وقفہ) تمہارے اس نوکر کا کیا نام ہے۔

شیلا۔ رامو۔

جگل۔ رامو۔ ذرا آگے آؤ ــ آ جاؤ۔ ڈرو نہیں

(وقفہ)

جگل۔ شیلا۔ اس کی آنکھوں میں تمہیں دو میلے آنسو نظر آ رہے ہیں؟

شیلا۔ آ رہے ہیں۔

جگل۔ یہی آنسو میرا تحفہ ہے جو یہاں اور کسی کی آنکھوں میں نظر نہیں آتے ــــ میں نے اپنی زندگی کی سب سے قیمتی چیز تمہیں دے دی ہے ــــ رامو بیڑی ہے تمہارے پاس؟

رامو۔ ہے سرکار۔

جگل۔ ایک سلگا کر مجھے دو۔

(ماچس کی کھڑکھڑاہٹ)

جگل۔ (بالکل دھیمے لہجے میں) آوارہ گرد ــــ لچا ــــ بدمعاش .... (آواز بالکل ڈوب جاتی ہے۔

رامو۔ لیجیے سرکار بیڑی۔

ادیب مالیگانوی

خوابِ امن

وہ سورج جو نظر افروز کرنیں لے کے آتا تھا
دلِ ہر ذرہ جس سے زندگی کا نور پاتا تھا
چمک جاتی تھی قسمت جس سے گلزار و بیاباں کی
جو اپنی چادرِ زر کار ہر شئے پر بچھاتا تھا
دلوں کو عزمِ نو کا حوصلہ دیتی تھی ضو جسکی
امیدوں کی نئی دُنیا جو آنکھوں کو دکھاتا تھا

پیامِ دردِ آگیں اب وہی ہر صبح لاتا ہے
حقیقت میں ہے دل زخمی بظاہر مسکراتا ہے

وہ مستانہ ہوائیں جن میں کیفیت تھی مستی تھی
فضاؤں میں تھا نشہ آسماں سے مے برستی تھی
ہر اک جنبش سے جن کی جاگ اٹھتے تھے کنول دل کے
عروسِ حسنِ فطرت چاندنی کیطرح ہنستی تھی
تڑپ ہوتی تھی پیدا جن سے افسردہ تمنا میں
نگاہِ فیض میں جن کی نہ رفعت تھی نہ پستی تھی

وہی تمہید دورِ یاس و حرماں بن کے چلتی ہیں
مصیبت کے خیالاتِ پریشاں بن کے چلتی ہیں

وہ صبح و شام، جو گہوارۂ انوارِ فطرت تھے
جو شاعر کی نگاہوں میں محبت ہی محبت تھے
خیالوں کو عطا کرتا تھا رفعت جن کا نظارہ
جہاں بکھرے ہوئے چاروں طرف سامانِ راحت تھے

اماں ملتی تھی جن کی گود میں مغمومِ انساں کو
جو بزمِ آب و گل میں حسن و رعنائی کی جنت تھے

انھیں پر اب ہے اک خونیں ادا سی کا سماں پیدا
کیا کرتے تھے جلوے جن کے اک ذوقِ جواں پیدا

وہ دلکش چاند! جسمیں روشنی تھی روئے سلمیٰ کی
شرابِ سرمدی جس ساغرِ زریں سے چھلکا کی
تھی سازِ زندگی کا تار جس کی ہر کرن گویا
مٹا دیتی تھی غم جس کے ترانوں کی طربناکی
پریشانی کو جس نے دولتِ کیف و سکوں دیکر
کہانی ختم کر دی، کاوشِ آلامِ دُنیا کی

وہی منظر ہے، لیکن زندگی کی ضو سے خالی ہے
شبِ مہتاب گویا ایک تصویرِ خیالی ہے

فسوں جیسے تباہی نے پڑھا ہے بزمِ عالم پر
نظر مریخ کی گویا لگی تھی دیر سے، ہم پر
قیامت مشرق و مغرب میں یکساں کار فرما ہے
کریں کس کس سے ہمدردی چلیں کس کس کے ماتم پر
یہ دورِ علم و حکمت ہے، کہ عہدِ ظلم و وحشت ہے
رکھی جاتی ہے تہذیب و تمدن کی بنا بم پر

خود اپنے خون میں ڈوبی ہوئی تصویر تو دیکھو
ذرا دنیا کے "خوابِ امن" کی تعبیر تو دیکھو

بسم اللہ بیگم عصمت

مصارفِ غذا میں کفایت شعاری

چیزوں کے غلط اور بلاضرورت استعمال سے بچنے کا نام کفایت شعاری ہے۔ جو لوگ کفایت شعاری کو کنجوسی کہتے ہیں یا کنجوسی کو کفایت شعاری سمجھتے ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں۔ دراصل یہ فضول خرچی اور بخل کی تباہ کن عادتوں کے درمیان اعتدال کی ایک حیات بخش راہ اور قدرت کا ایک اٹل اور ہمہ گیر قانون ہے۔ آپ کائناتِ عالم پر غور کیجئے آپ کو ہر جگہ اور قدرت کے ہر ایک کام میں کفایت شعاری کے ثبوت ملیں گے۔ قدرت بے شمار اور لازوال خزانے رکھنے کے باوجود اپنی کسی چیز اور کسی طاقت کو غلط طریق پر یا بلاضرورت استعمال نہیں کرتی۔ اس کا یہ عمل انسانوں کے لئے ایک سبق ہے۔ چنانچہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ کفایت شعار قومیں اور خاندان ترقی کرتے اور فضول خرچ قومیں اور خاندان تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔

ہماری قوم نے کفایت شعاری کے سبق کو بھلا دیا ہے۔ فضول خرچی کے نتائجِ بد کی طرف سے اس کی آنکھیں بند ہیں۔ عالمگیر جنگ کی وجہ سے نہایت تکلیف دہ حالات پیدا ہو گئے ہیں، ضروریاتِ زندگی بالخصوص سامانِ غذا نہایت تیزی کے ساتھ گراں و کمیاب ہو رہا ہے۔ ہندوستان کے کئی ایک علاقوں شلاً بنگال و مالابار میں ہولناک قحط رونما ہو چکا ہے موجودہ زمانہ میں ہمیں نہ صرف اپنے فائدہ کے لئے بلکہ ملک و قوم اور دنیا کی بھلائی کی خاطر بھی پہلے سے بہت زیادہ کفایت شعاری کا خیال رکھنا چاہیئے۔ غذا انسان کی اولین اور سب سے زیادہ اہم مادی ضرورت ہے۔ آج کل اسی کی وجہ سے زیادہ پریشانی ہے۔ ایک عقلمند کا قول ہے کہ باورچی خانہ کی فضول خرچی مفلسی کی دعوت ہے۔ ہمارے اکثر گھروں میں باورچی خانوں کی حالت اس لحاظ سے ناگفتہ بہ ہے وہ ارزانی کے زمانہ ہی میں مفلسی کو دعوت دے رہے تھے اب موجودہ ہوش ربا گرانی عالم میں مفلسی کے ساتھ مکمل اقتصادی تباہی کو بھی بلا رہے ہیں لہٰذا میں سب سے پہلے غذا کے مسئلہ ہی کو لیتی ہوں اور اپنی بہنوں کے سامنے مصارفِ غذا میں بچت کے چند عملی طریقے پیش کرتی ہوں اگر خواتین اپنے اپنے گھروں میں ان طریقوں پر عمل کریں تو مجھے امید ہے کہ مصارفِ غذا میں نمایاں کمی ہو جائے گی۔ اس طرح خواتین نہ صرف اپنے خاندانوں کو مالی پریشانیوں سے بہت بڑی حد تک محفوظ رکھ سکینگی بلکہ وہ کم از کم زمانۂ جنگ میں اپنی کفایت شعاری کے ذریعہ ملک و قوم اور حکومت کی بھی ایک گراں قدر خدمت انجام دیں گی۔ یہ مضمون لکھتے وقت متوسط طبقہ کے ایسے گھرانے جن کی آمدنی چالیس پچاس روپیہ سے اڑھائی تین سو روپے تک ہے میرے پیشِ نظر ہیں۔ لیکن امراء و غربا بھی اپنے اپنے حالات کے مطابق ان طریقوں میں معمولی تبدیلی کر کے اُنسے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

ہمارے گھروں میں غفلت کاہلی اور غلط

آرام طلبی کا بہت زور ہے۔ مرد اور عورتیں دونوں بالعموم اُن میں مبتلا ہیں۔ جس کے نتیجہ میں احساس احتیاط اور سلیقہ کی کمی ہے۔ بہت سے گھروں میں میاں بیوی کو، اپنی مالی حالت ہی کا صحیح علم و احساس نہیں ہے بے پروائی سے اندھا دھند خرچ ہوتا ہے۔ کاہلی و آرام طلبی کی وجہ سے نوکروں اور دکانداروں پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کیا جاتا ہے۔ میاں کو بازار جاکر نرخ دریافت کرنے اور سودا خریدنے میں عار ہے۔ بیوی باورچی خانہ سے بے پروا۔ دکانداروں کے ہاں کھاتے کھلے ہوئے ہیں۔ تمام چیزیں قرض، چٹھی پر آرہی ہیں۔ بے سوچے سمجھے جو چاہا نوکر سے کہہ دیا۔ وہ دیکھے بھالے بغیر بنئے، قصاب، گولی اور ترکاری والے کے ہاں سے قرض سودا لے آیا۔ ماما یا باورچی نے جیسا جی چاہا پکا دیا اس طرح روپے اور جنس کا معقول حصہ ضائع جاتا ہے۔ زمانہ کی کیفیت کو دیکھو حالات کا صحیح اندازہ کرو، غفلت اور کاہلی کو چھوڑ کر سلیقہ اور احتیاط سے کام لو۔ یہ کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ اکثر خاندان صرف چند ماہ کی کوشش و ضبط کے بعد قرض کی بجائے نقد سودا منگانے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ میری تحریک پر بہت سی خواتین نے استقلال کے ساتھ کوشش کی اور بہت جلد سابقہ قرضہ بے باق کر کے ہر ایک چیز نقد منگانے کے قابل ہو گئیں۔ ہر ماہ پوری احتیاط کے ساتھ باورچی خانہ کی ضروریات کا اندازہ لگاؤ اور مردوں کو مجبور کرو کہ وہ خود بازار جاکر یا کم از کم اپنی نگرانی میں نرخوں کا پوری طرح اطمینان کر کے جنس لائیں۔ غلہ وغیرہ گھر میں آجائے تو اس کو اچھی طرح دیکھ بھال لو۔ اس کا وزن کر لو۔ ترازو سے آپ کو نفرت نہ ہونی چاہیئے۔ پھر تمام اشیائے خوردنی حفاظت و سلیقہ سے رکھو تاکہ وہ سڑنے سوکھنے کیڑوں، مکوڑوں اور چوہوں وغیرہ سے بالکل محفوظ رہیں۔ نقدی کی طرح غلہ کا بھی باقاعدہ حساب رکھو۔ ہر روز حساب سے ضرورت کے مطابق جنس پکانے کے لئے نکالو۔ نوکروں کو ان کا حق ضرور دو یہ آپکا ایک اخلاقی و انسانی فرض ہے لیکن انھیں چیزوں کو چرانے اور ضائع کرنے کا موقع ہرگز نہ دو۔

ہمارے ہاں عام طور پر تعلیم کے رواج کے ساتھ ساتھ عورتوں کو باورچی خانے سے نفرت ہوتی جا رہی ہے۔ یہ بہت افسوس ناک بات ہے متوسط گھرانوں میں ماما یا باورچی بشرطِ گنجایش ہی رکھنا چاہیئے ورنہ گھر کی بیبیاں خود اپنے ہاتھ سے پکائیں۔ باورچی یا ماما کی موجودگی میں بھی سارا کام ان پر چھوڑ دو۔ اپنی نگرانی میں مناسب ہدایات کے ساتھ پکواؤ۔ ہر ایک بات میں کفایت شعاری سلیقہ و صفائی اور اصول حفظان صحت کا لحاظ رکھو یہ خیال بالکل غلط ہے کہ صرف مرغن اور زیادہ لاگت کے کھانے ہی مقوی اور خوش ذائقہ ہوتے ہیں۔ بلکہ اکثر ایسے کھانے صحت کو خراب کرتے اور عادتوں کو بگاڑتے ہیں معمولی ارزان چیزیں بھی جب صفائی ستھرائی اور صحیح ترکیب سے پکائی جائیں تو خوش ذائقہ اور مفید صحت بن جاتی ہیں۔ تعلیم یافتہ عورتوں کو اس کا ضرور علم ہونا چاہیئے۔ کہ کونسی چیز ان کی صحت کے لئے مفید یا مضر ہے اور اسے کس طریق پر پکانا اور استعمال کرنا چاہیئے ایک طبیب کا قول ہے کہ "کونسی خوراک تمہارے موافق اور کونسی مضر ہے۔ اگر تم یہ تمیز کر سکتے ہو تو تندرستی تمہاری غلام بن کر رہے گی، باورچی خانہ کی صفائی کے علاوہ کھانا بھی صاف ستھرا، اچھے رنگ اور اچھے ذائقہ اور اچھی خوشبو کا ہونا چاہیئے۔ بدرنگ بدمزہ، جلا ہوا، داغ لگا ہوا اور مضر صحت نہ ہو۔ کم لاگت میں بھی ایسے روزمرہ کے مفید صحت اور خوش ذائقہ

کھانے بآسانی تیار کئے جاسکتے ہیں۔ اگر گھروں میں عورتیں اِس کا اہتمام کریں کہ اُن کے مردوں اور بچوں کو صاف ستھرے باورچی خانہ میں صفائی کے ساتھ پکا ہوا صاف ستھرا خوش ذائقہ سادہ کھانا بر وقت مل جایا کرے تو کم از کم روز مرّہ کی زندگی میں مرغن اور زیادہ لاگت کے پر تکلف کھانوں کی ضرورت تقریباً باقی نہ رہے گی۔ مرد اور بچے ہوٹلوں اور بازاروں کی میلی کچیلی، مضر صحت اور گراں اشیائے خوردنی سے خود بخود نفرت کریں گے۔ اِس طرح اخراجات خورد و نوش میں کافی بچت ہو سکیگی۔ بچوں کو شروع ہی سے بازار کی چیزوں سے بچاؤ، انھیں چٹورپن کی عادت ہرگز نہ ڈالو، کسی نے خوب کہا ہے کہ دنیا کی مصیبتوں کا تین چوتھائی حصہ زبان کا پیدا کردہ ہے۔ اس کے ماخذ طعام و کلام ہیں یہ بات بالکل سچی ہے۔ اس وقت کلام تو زیر بحث نہیں لیکن طعام کے بارہ میں بے راہ روی اور بے احتیاطی کی وجہ سے ہماری قوم کافی حد تک برباد ہو رہی ہے۔ بچوں کو چٹورپن سے بچانا اسی صورت میں ممکن ہے کہ آپ اُن کے سامنے اپنا عملی نمونہ پیش کریں۔ محنت اور فرض شناسی سے کام لو اور گھروں میں بر وقت کھانا اور ناشتہ تیار کرو۔ اسی طرح بہت سے میٹھے، شربت، اچار اور ناشتے وغیرہ کی چیزیں جو اکثر بازار سے منگائی جاتی ہیں۔ بہت کم لاگت میں گھروں پر تیار کی جاسکتی ہیں۔ صاف ستھری سادہ اور متوازن غذا سے صحتیں اچھی رہیں گی۔ علاج اور دواؤں پر جو بے تحاشا خرچ ہو رہا ہے اُس سے نجات ملیں گی۔ علاوہ ازیں کم از کم موجودہ گرانی کے زمانہ میں یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ متوسط اور غریب طبقہ کے گھروں میں "ڈبہ کی چیزوں" کا استعمال سوائے شدید طبی ضرورتوں کے بالکل ترک کر دیا جائے۔ چائے اور اُس کے لوازم میں بھی تخفیف ضروری ہے۔

کھانے اور باورچی خانے کی صفائی کی طرح کھانے کے برتنوں، کھانا کھانے کی جگہ اور پانی کی صفائی کا بھی خیال رکھنا چاہئیے۔ چینی اور شیشے کے جلد ٹوٹ پھوٹ جانے والے بیش قیمت برتن، چھری، کانٹے اور میز کرسیاں ضروری نہیں ہیں بلکہ ان چیزوں کو حتی الامکان ترک کردیں۔ معمولی برتن اور دسترخوان اگر پاک و صاف ہوں تو کافی ہیں۔ کھانا رغبت سے کھایا جائے گا اور جزو بدن ہو گا۔

مہمان کے لئے معمولی تکلف میں مضائقہ نہیں لیکن غیر معمولی تکلف ہرگز نہ ہو۔ امام غزالی ؒ نے بالکل سچ فرمایا ہے کہ "مہمان کے ساتھ تکلف نہ کرو ورنہ مہمان رکھنے کو تم دشمن رکھوگے" مہمانوں کی عزت و تواضع ضرور کرو، اُن کے ساتھ محبت و خلوص کے ساتھ پیش آؤ۔ انھیں حتی الامکان آرام پہنچاؤ۔ اپنی استطاعت کے مطابق اچھا کھلاؤ۔ لیکن اپنی جیبیں خالی کرکے اُن کے معدوں کو خراب ہرگز نہ کرو۔ بس اِس قدر کافی ہے کہ انھیں روزمرّہ سے ذرا اچھا کھانا اور ناشتہ بر وقت احترام کے ساتھ دیدو۔ تقریبات اور دعوتوں میں بھی زیادہ قسم اور زیادہ مقدار کے کھانوں کا رواج ترک کردینا چاہئیے۔

بعض نہیں بلکہ اکثر گھروں میں بہت سی سفید سبزیوں، ترکاریوں اور غلّوں کا استعمال ان کی کثرت و ارزانی کی وجہ سے شان کے خلاف سمجھا جاتا ہے اور یہ خیال کرلیا گیا ہے کہ وہ صرف فاقہ کش غربا کے لئے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ یہ بہت بڑی نادانی ہے ایسی ترکاریوں اور غلوں کے استعمال کی عادت رکھو۔ مثلاً چاول اور گیہوں کے ساتھ کبھی کبھی تھوڑی مکئی۔ جوار یا باجرہ بھی کھا لیا جائے۔ اگر صحت اجازت دے تو گھی اور شکر کی بجائے وقتاً فوقتاً تھوڑا تیل اور گڑ بھی استعمال کرلیا کریں۔ اِس طرح بہت نہیں تو تھوڑی بچت ضرور ہو سکتی ہے۔ طبائع مشکلات کا مقابلہ کرنے کی عادی رہتی ہیں۔ بعض چیزیں بالخصوص سبزیاں تیل میں زیادہ خوش ذائقہ پکتی ہیں۔ مناسب طریقوں سے تیل کے مضر اثرات کو کافی حد تک کم کیا جاسکتا ہے۔

میں نے بہت سی پڑھی لکھی عورتیں ایسی دیکھی ہیں کہ وہ تیل میں تلے ہوئے پاپڑ بھیجئے میلی کچیلی دکانوں سے چار چار آنے کے منگا کر کھا لیتی ہیں۔ لیکن اپنے باورچی خانوں میں تیل کے کبھی کبھی کے استعمال کو بھی گوارا نہیں کرتیں اور صاف کہہ دیتی ہیں کہ تیل ہمیں ہضم ہی نہیں ہوتا۔ حالانکہ اُن کے ہاں بناوٹی یا ملاوٹ کا جو گھی آتا ہے وہ بالعموم عمدہ خالص تیل کی نسبت زیادہ مضرِ صحت ہوتا ہے۔

میں نے اب تک جو کچھ بیان کی اس سے زیادہ تر مصارفِ غذا میں کمی ہو گی لیکن موجودہ زمانہ میں چیزوں کی کمیابی کی وجہ سے اِس امر کی شدید ضرورت پیدا ہو گئی ہے کہ کم مقدار اشیائے خوردنی میں گزر کی جائے۔ اِس کے متعلق بھی میں چند طریقے مختصر الفاظ میں عرض کرتی ہوں۔

(۱) بالعموم ہم لوگ ضرورت سے زیادہ کھاتے پیتے ہیں جو مضرِ صحت بھی ہے۔ متوازن غذا اگر صحیح طریقے سے اچھی طرح چبا کر کھائی جائے تو اُس کی کم مقدار ہی کافی ہوتی ہے۔ اِس لئے جو لوگ ضرورت سے زیادہ کھاتے ہیں انھیں کوشش کر کے غذا کی مقدار کو رفتہ رفتہ اعتدال پر لے آنا چاہئے۔ پُرخور اور شکم پرست افراد اپنی قبر اپنے دانتوں سے کھودتے ہیں، ایک حکیم نے بالکل سچ کہا ہے کہ "اعتدال ایسا درخت ہے جس کی جڑ قناعت اور پھل آسودگی ہے" لہٰذا ہمیں کھانے پینے میں اعتدال کو مدِ نظر رکھنا چاہئے۔

(۲) پکانے میں غذا کو جلنے اور خراب نہ ہونے دینا چاہئے۔ ضرورت سے زیادہ چیزیں خریدی اور پکائی نہ جائیں۔ حتی الامکان کوشش کرو کہ کھانا باسی نہ بچے۔

(۳) بعض گھروں میں بچے اچھی تربیت اور عمدہ انتظام و سلیقہ نہ ہونے کی وجہ سے کافی مقدار میں کھانا ضائع کر دیتے ہیں۔ ایک آدھ چپاتی کھائیں گے تو دو خراب کر دیں گے۔ اِس کی اصلاح بھی ضروری ہے۔ بچوں کو دسترخوان کے آداب اور تمیز کے ساتھ کھانا سکھاؤ۔ اُن کے سامنے اپنا عمدہ نمونہ پیش کرو۔

(۴) غیر ضروری لوازمات دسترخوان طرح طرح کے اچار چٹنیاں، مربے اور میٹھے بہت بڑی حد تک کم کر دیئے جائیں

(۵) غلہ کی طرح ایندھن کی گرانی و کمیابی کی شکایت بھی عام ہے۔ اِس کے استعمال میں بھی احتیاط و کفایت سے کام لو۔ ایسے چولھے اور انگیٹھیاں استعمال کرو جن میں لکڑی اور کوئلہ کم جلے۔

(۶) بعض سبزیاں اور پھل ایسے ہیں جو کچے استعمال کئے جا سکتے ہیں اور اِس شکل میں وہ زیادہ مفید ہوتے ہیں اور نسبتاً کم مقدار میں کافی ہو جاتے ہیں۔ ایسے پھلوں اور سبزیوں کو آگ پر پکانے کی بجائے اکثر کچا استعمال کرنے کی عادت ڈالو۔

(۷) کوشش کر کے ایسے کھانے اور پکانے کے ایسے طریقے ایجاد کرنے چاہئیں جن میں ایندھن اور وقت کم خرچ ہو۔

(۸) بعض سبزیوں اور پھلوں کے چھلکے اور بیج وغیرہ خواہ مخواہ پھینک دیئے جاتے ہیں حالانکہ انھیں آسانی کے ساتھ خوش ذائقہ پکایا جا سکتا ہے۔ انھیں غذا کا جزو بنا لینا چاہئے

(۹) جن مکانوں اور بنگلوں میں کچھ موزوں زائد جگہ ہو وہاں پھل اور سبزیاں اُگانے، کچھ مرغیاں اور ایک دو گائے بھینس پالنے کی ضرور کوشش کی جائے، اِس طرح عمدہ، خالص دودھ، دہی، اور مسکہ اور گھی، تازہ انڈے اور سبزیاں مہیا ہوتی رہیں گی، اِن چیزوں کی افراط سے غلہ کے خرچ میں بھی کچھ کمی ہو جائے گی۔

احمد مجتبیٰ واثق بی۔اے

"عید"

زباں پر عید کا نغمہ ہے دِل مُرجھایا جاتا ہے
لبوں پر ہے تبسّم اور کلیجہ منھ کو آتا ہے
کہ ننگا ہے کسی کمبخت کا جسم آج کے دن بھی
کہیں کمخواب و دیبا فرش بن کر جگمگاتا ہے

گلے ملنے کا ساماں اور پائیں باغ کی سج دھج
یہاں تکمیلِ عشرت کا سبق دہرایا جاتا ہے
اُدھر اُس مینڈ پر اِس سوچ میں بیٹھا ہے اک دہقاں
کہ دیکھے آج کی ڈالی میں کیا انعام پاتا ہے

کوئی دستِ حنائی میں لئے ہے تہنیت کا خط
کہیں ترسا ہوا اک ہاتھ اٹھ کر تھرتھراتا ہے
اُٹھائی ہے کسی نے خیر مقدم کے لئے چلمن
کسی کمسن کو آج اُس کا رنڈاپا کھائے جاتا ہے

کہیں پر قہقہوں سے چھت اڑائی جاتی ہے لیکن
کہیں اُمید کا ٹوٹا سا دیپک ٹمٹماتا ہے
یہ کیسی عید ہے اے دوست اسکو اور کچھ کہہ لے
کہ سُنتے تھے ہلالِ عید روتوں کو ہنساتا ہے

نیر کاشمیری بی۔اے

وَارِدات

موجِ مئے سَرور ہوں مجھ کو اَلم سے کیا غرض
غرقِ خیالِ یار ہوں مجھ کو اِرم سے کیا غرض
لمحۂ جاوداں ہوں میں مجھ کو عدم سے واسطہ؟
حلقہ بگوشِ عشق کو دیر و حرم سے کیا غرض
تیری نظر میں حشر و زیست میری نظر ورائے کُن
بندۂ احتیاج تو، مجھ کو کرم سے کیا غرض

جہانِ خودی اِک فریبِ خودی ہے
فریبِ خودی ہی مگر زندگی ہے
ہر اک چیز سرشارِ ذوقِ کشاکش
جوانی یہی ہے۔ یہی زندگی ہے
فریبِ محبت تری بیقراری
وگرنہ محبت تو اک آگہی ہے
نہ ذوقِ گنہ ہے نہ وہ لغزشیں ہیں
جوانی پہ اک شام سی چھاگئی ہے
نہ راتوں میں وہ گریۂ ناصبوری
سحر میں نہ وہ رنگِ افسردگی ہے

کیپٹن شفیق الرحمن

ہماری فلمیں

ہماری فلموں سے مراد ہندوستانی فلمیں ہیں یعنی وہ فلمیں جو سودیشی ہیں، جن میں ہماری روزانہ زندگی کے نقشے کھینچے جاتے ہیں جس میں ہماری برائیوں اور کمزوریوں کو بے نقاب کیا جاتا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ ہماری فلموں نے اتنے تھوڑے سے عرصے میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ چند ہی سال کی بات ہے کہ یہاں نہایت مضحکہ انگیز فلمیں بنی تھیں جن کے خیال ہی سے ہم شرمندہ ہو جاتے ہیں اور ہماری پیشانی پر پانچ چھ قطرے پسینے کے آجاتے ہیں لیکن اب خدا کے فضل سے، ایسی فلمیں بنتی ہیں جن پر ہم فخر کر سکتے ہیں، اب ڈنڈے مار فلموں کا زمانہ گیا۔ بادشاہوں کے محلوں اور سنیاسیوں کے غاروں سے اب کیمرے کا رُخ ایک معمولی خاندان کے گھر کی عمارت کی جانب ہو گیا ہے، اب ہماری فلمیں ہماری روزانہ زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ ہم اس ترقی پر یقیناً بہت خوش ہیں۔ بعض اوقات ہم اکیلے میں مسکرانے لگتے ہیں اور دیر تک مسکراتے رہتے ہیں۔ مسرت سے ہماری باچھیں کھل جاتی ہیں، فخر سے ہمارا سینہ تن جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود بعض اوقات کچھ عجیب سے خیالات ہمارے دل میں آتے ہیں، ہم بہت کوشش کرتے ہیں کہ اس اُلجھن سے باہر نکل آئیں لیکن مجبور ہو کر عجیب الٹی سیدھی باتیں سوچنے بیٹھ جاتے ہیں۔

پہلے تو ہم اپنے "پروڈیوسر" حضرات کی دریا دلی پر آٹھ آٹھ آنسو بہانے بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک فلم جانے کتنی لمبی ہوتی ہے شاید کئی میل لمبی ہوتی ہو ساری ساری رات ایک ہی فلم دیکھتے رہتے ہیں اور جب ٹریلر دیکھتے ہیں تو قریب قریب ساری فلمی کہانی سُن لیتے ہیں۔ اب اگر کہانی کو دوہرانا ہو تو اصلی فلم بھی دیکھ لیجئے۔

فلمی ناموں کے متعلق ایک چیز جو ہمیں چڑاتی رہی وہ ہے "عرف" نہ جانے یہ لفظ کیوں ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتا فلم کا ایک اچھا بھلا سا نام رکھا ہوا ہے، پھر بھی یہ عرف صاحب ضرور تشریف لائیں گے اور اپنے ساتھ ایک اور نام بھی لے آئیں گے، مثلاً "سماج کا شکار" عرف "خون بھری تلوار" یا "شہزادہ بکرم" "عرف مفلس عاشق"۔

یہیں اکتفا نہیں کی جاتی بلکہ معاملہ اور آگے چلتا ہے اور جواب الجواب کے وزن پر "عرف العرف" شروع ہوتا ہے یعنی "عجیب و غریب حسینہ" عرف "بہادر سوار" عرف "نسیم صبح"۔ خیر! یہاں تک تو ہم برداشت کر سکتے ہیں، لیکن اس سے آگے تو زیادتی ہونے لگتی ہے اور عرف ایسا رکھا جاتا ہے جس کا اصلی نام سے کوئی تعلق نہیں ہوتا مثلاً "خطرناک کتا" عرف "بدنصیب گدھا" یا "نالائق سپاہی" عرف "کوہ قاف کی پری"۔

. . . .

ایک اور بات جو ہمیں اپنی فلمیں دیکھنے کے بعد

معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ جب محبت ہونی ہو تو یوں منٹوں میں ہو جاتی ہے اور ایک ہفتے کے اندر اندر دونوں کا بُرا حال ہو جاتا ہے۔ اَب اِس معاملے میں ہمیں کوئی ذاتی تجربہ تو ہے نہیں لیکن یہ ضرور سُنا ہے کہ اصلی محبت ہونے میں کم از کم چھ ماہ سے ایک سال تک کا عرصہ لگتا ہے۔

لیکن یہاں انکشاف ہوتا ہے کہ محبت کے لئے فقط ایک چیز ضروری ہے، اور وہ ہے ایک لڑکے اور لڑکی کی ملاقات۔ شام کو اگر لڑکا سینما گیا تو لڑکی ضرور وہیں ملے گی اور اگر لڑکی سرکس گئی تو لڑکا ضرور وہیں ہوگا۔ اگلے روز لڑکے کو تار ملے گا کہ فوراً گھر پہنچو، ریل کے ڈبے میں بیٹھتے ہی اُسے پتہ چلے گا کہ اتفاق سے لڑکی بھی اُسی ڈبے میں بیٹھی ہے۔ راستے میں اُن کے صندوق بدل جائیں گے، پھر ایک ادھیڑ عمر کے شخص کو لڑکا وہیں کہیں کسی آفت سے بچالے گا اور وہ شخص لازمی طور پر اسی لڑکی کا والد ہوگا اور جب لڑکی کے والد تک معاملہ پہنچ جائے تو سمجھ لیجئے کہ اَب شادی ہو کر رہے گی۔ اِس قِسم کے حادثات ہوتے رہیں گے حتےٰ کہ دونوں کی شادی ہو جائے گی، شادی کے بعد غالباً حادثے بالکل بند ہو جائیں گے اور دنیا میں سکون آجائے گا۔

اور ساتھ ہی ایک گہرے راز کا اِنکشاف ہوتا ہے وہ یہ کہ ہندوستان میں وہی شخص محبت کرسکتا ہے جو بہت اچھا گاتا ہو۔ جسے گانا نہ آتا ہو اُس شخص کو اتنا سا بھی حق حاصل نہیں کہ محبت کے متعلق کچھ سوچے بھی البتہ وہ کوشش کرے تو ولین (VILLAIN) کا کام کرسکتا ہے، دو محبت کے متوالے دلوں کے بیچ میں ٹانگ اڑا سکتا ہے بس!

اَب سوچئے تو سہی کہ ایک حسین خاتون (جن سے آپ محبت کرنے پر تلے ہوئے ہیں) ایک چھوٹی سی بلی یا تتلی کو دیکھ کر اِتنی مسرور ہوتی ہیں کہ فوراً فی البدیہہ نظم کہہ کر اُسے گانے لگتی ہیں، اگر آپ کسی درخت کی آڑ میں وکٹ کیپر کی طرح جھکے ہوئے تاک لگائے کھڑے ہوں تو اُس وقت آپ کا پریم تبھی ظاہر ہوگا جب آپ ایک ہاتھ لہرا کر نعرہ لگائیں اور گانا شروع کر دیں۔

اور اگر آپ فی البدیہہ اشعار نہیں کہہ سکتے، اور فوراً ہی اُسی سُر میں گا نہیں سکتے اور آپ اُن کے گاتے ہی فوراً کسی جھاڑی کے پیچھے سے نکل نہیں آتے یا کسی درخت سے دھم سے نہیں کود پڑتے تب آپ خاطر جمع رکھئے کہ آپ ہرگز ہرگز پریم کے حقدار نہیں۔

آپ کو چاہیئے کہ چوبیس گھنٹے اُن کی کوٹھی کا پہرہ دیں اور اسی تاک میں رہیں کہ وہ خاتون کس وقت اپنے کمرے میں، یا اپنے باغ میں یا باورچی خانے میں یا سیڑھیوں پر گانا شروع کرتی ہیں بس یہ سنہری موقع ہے آپ بلند آواز سے جواباً گانا شروع کر دیجئے چاند پر ایک بدلی آجائے گی، بلبلیں چہچہانے لگیں گی (اگر وہ سوئی پڑی ہیں تو اُنھیں اُٹھانا پڑے گا) ان خاتون کے گھر کے تمام افراد کے کانوں پر پہرے لگ جائیں گی سب کے سب اس وقت تک بہرے رہیں گے جب تک آپ دونوں گانے کا شغل ختم نہیں کرتے۔

اگر وہ لوگ چونکیں گے تو آپ کے گانے سے نہیں، بلکہ آپ کی سرگوشیوں سے۔

یا اگر آپ اپنے کمرے میں بیٹھے اُن کی یاد میں گا رہے ہیں (بلکہ رو رہے ہیں) پر آپ کا نوکر کمرے میں چاء لائے گا اور چپ چاپ واپس چلا جائے گا باہر جاتے وقت اس کی آنکھوں میں آنسو ہونگے آپ کا پیارا کتا فرش پر بیٹھا زار و قطار رو رہا ہوگا باہر ٹہنیوں پر بیٹھے ہوئے غمگین پرندے چٹاخ چٹاخ زمین پر گرتے ہوں گے اور گرتے ہی دم نکل جاتا ہوگا۔

دیکھتے دیکھتے ہی بادل اُمڈ آئیں گے، بجلیاں کوندنے لگیں گی، یکلخت موسلا دھار بارش شروع ہو جائے گی اور آپ کا جنون دگنا ہو جائے گا۔ آپ یکا یک چلا چلا کر گانا شروع کر دیں گے، عین اُس وقت سامنے دیوار پر آپ کو اپنے محبوب کا چہرہ دکھائی دے گا (تصور میں) وہ آپ کی منتیں کریں گی کہ صاحب اب رہنے دیجئے اور مت گائیے، اِس طرح میری صحت پر بُرا اثر پڑتا ہے، لیکن آپ ہرگز نہ باز آئیں گے اور دگنے جوش و خروش سے گانا شروع کر دیں گے، پھر یکلخت ایک فلک شگاف دھماکا ہوگا، آپ سہم کر رہ جائیں گے ——

ایک سادھو بارش میں بھیگتا ہوا ایک مستانہ آواز میں گاتا جا رہا ہوگا، آپ اُسے للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے لگیں گے۔ آپ کے سامنے آکر تو وہ بالکل ہی آہستہ آہستہ چلنے لگے گا پر اُس کی کوشش یہی ہوگی کہ کسی طرح وہ اپنا گانا پورا کر دے، جب تک وہ گاتا رہے گا تب تک بجلیاں نہیں کڑکیں گی، بارش بھی دھیمی پڑ جائے گی، جونہی اُس نے گانا ختم کیا ایک دم بادل جاگ اُٹھیں گے، دھڑام چٹاخ —— پٹاخ شروع ہو جائے گی۔ آپ ایک سرد آہ بھریں گے اور کہیں گے —— "کاش کہ میں ایک سادھو ہوتا" یا یہ کہ "کاش کہ ہم سب سادھو ہوتے"!

. . . .

اِس حقیقت سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ہمارے ہاں ولین سے بہت بے انصافی کی جاتی ہے، یہاں تک کہ ہال کا ہال لٹھ لے کر پیچھے پڑ جاتا ہے، ذرا ولین نظر آیا اور گالیوں کی بوچھاڑ شروع ہوئی۔

"مارو خبیث کو ——!

"نابہنجار، بدبخت! —— فلاں کا پٹھا —— بدتمیز!"

ہاتھ پیر توڑ ڈالو کمبخت کے!"

دراصل ہمیں ولین ایک نہایت ہی ڈراؤنی چیز دکھائی جاتی ہے جس میں دنیا بھر کے عیب ہوتے ہیں اور ولین کا ہوّا لوگوں کے دلوں میں اِس قدر بیٹھ گیا ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ فلم میں ولین بالکل نہ ہو، فقط ہیرو ہیروئن ہوں، اُن کے والدین، ایک دو مسخرے، اور چند نیک چال چلن والے آدمی ہوں بس!۔

جب ولین کی مرمت ہوتی ہے تو ہر شخص کا دل مسرت سے رقص کرنے لگتا ہے۔ اُدھر ولین کیا مجال جو ذرا سی مدافعت بھی پیش کرتا ہو، ہٹا کٹا ولین ایک مرے ہوئے ہیرو سے بڑی بے تکلفی سے مار کھاتا رہتا ہے۔

اور پھر ایک پرندوں کا جوڑا بھی عرصے سے ہمارے سینے پر مونگ دل رہا ہے، آندھی ہو، طوفان ہو، بجلیاں کڑکیں اولے پڑیں، وہی پرندوں کا جوڑا ضرور ٹہنی سے چپکا ہوا ہوگا، دونوں پرندے ایک دوسرے کو پیار کر رہے ہونگے اور دل ہی دل میں قدرت کے اُن ڈراؤنوں پر ہنس رہے ہوں گے کہ یہ کیا چھچھوری کوششیں ہمیں ڈرانے کے لئے کی جا رہی ہیں۔

اور اُسی موقع پر ہمیں ہیرو اور ہیروئن بارش میں کھڑے بھیگ رہے ہوں گے، اُن کے نزدیک گھنے درخت بھی ہوں گے، کوئی دالان بھی ہوگا لیکن توبہ کیجئے بس بھیگنا جو ہوا۔ دالان میں کھڑے ہو کر تو ہر کوئی محبت کر سکتا ہے مزا ہے کہ محبت بارش میں بھیگ کر کی جائے۔ اور پھر کہیں پرندوں کا جوڑا بھی ٹہنی پر بیٹھا بھیگ رہا ہو تو زہے قسمت۔

اگر ہیروئن اکیلی کھڑی بھیگ رہی ہے تو وہ ضرور بھاگے گی، اور ہیروئن ایسے موقع پر سیدھی کبھی نہیں بھاگتی۔ ہمیشہ لمبے سے لمبا اور مشکل ترین راستہ اختیار کرے گی، راستے سے دُور کوئی درخت کھڑا ہے۔ یہ ضرور دوڑ کر اُس میں ٹکر مارے گی، اگر ٹھوکر کے لئے پتھر نہیں نہیں ملتا تو تلاش کر کے کوئی پتھر ضرور ڈھونڈے گی اور پھر دھڑام سے گر پڑے گی۔

اُدھر لوگوں کو شروع سے آخر تک یہی انتظار رہتا ہے کہ

اُن کی شادی کب ہوگی، ہیرو ہیروئن کی اُستاد اور اُستانی کی، ہیرو کے دوست اور ہیروئن کی سہیلی کی۔

بیچ میں مشکلات آتی ہیں، مصیبتیں ٹوٹتی ہیں لیکن شادی کا پروگرام بدستور صحیح رہتا ہے، اگر ہیرو آسٹریلیا چلا گیا اور ہیروئن تبت چلی گئی اور دُور کہیں پہاڑوں میں چھپ کر جوگن بن گئی تب بھی دُنیا کی کوئی طاقت انھیں شادی کرنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ کسی نہ کسی دن ایک ہوائی جہاز آئے گا جس میں ہیرو بیٹھا ہوگا۔ اور اس ہوائی جہاز کا پٹرول اُسی پہاڑ کے اُوپر ختم ہوگا جہاں ہیروئن بیٹھی پوجا کر رہی ہوگی، ہوائی جہاز دھڑام سے گرے گا، باقی سب اناللہ ہو جائیں گے فقط ہیرو بچ جائیگا اور شادی ہو جائے گی۔

ہمارے ہاں ہر پانچ سو کامیڈی کے بعد ایک ٹریجیڈی بھی بنتی ہے، اور اُس میں یہ ہوتا ہے کہ یا تو ہیروئن کے اَبا کا انتقال ہو جاتا ہے (ہیرو کی جان بچاتے ہوئے) یا ہیرو کی محبوبہ نمبر دو ہلاک ہو جاتی ہے (وہ بھی ہیرو کی جان بچاتے ہوئے۔ کیونکہ ہیرو کا زندہ رہنا تو فلم کی جان ہے) یا یوں کہ ہیرو ہیروئن میں سے شادی کے بعد ایک رحلت کر جاتا ہے (عموماً ہیروئن ––– کیونکہ اس کی صحت محبت سے کمزور ہو جاتی ہے) پھر ہیرو چیخیں مارتا ہے، پتھروں اور درختوں سے دل کی باتیں کہتا ہے، بلطخوں کو پکڑ پکڑ کر اُن سے باتیں کرتا ہے، بکریوں کے سامنے روتا ہے، اُونٹوں کی قطار دیکھ کر وہ بے اوسان ہو جاتا ہے اور ہیروئن کو یاد کرتا ہوا کسی ریگستان میں نکل جاتا ہے۔

پھر اتنے میں ایک سادھو (جو دیر سے انتظار میں بیٹھا ہے) ایک دردناک گانا گاتا ہوا ایک جھیل کے سامنے سے گزرتا ہے۔ جھیل میں اس کا سایہ پڑ رہا ہے، دُور کہیں سورج غروب ہو رہا ہے لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں، ہاتھ پاؤں میں تشنج آجاتا ہے۔

لیکن ایک بات کی تسلی رہتی ہے ––– آخر شادی تو ہوگئی تھی نا۔

. . . .

ایکٹروں کی صحت کے متعلق ہمیں بڑا فکر رہتا ہے ہمارے ڈائریکٹر حضرات زیادہ طور پر انتہا پسند ہیں، یا تو ہمیں تپ دق کے مارے ہوئے ہیرو دکھلائے جاتے ہیں اور یا ایسے جیسے بورا رکھا ہو، اب ان دونوں قسم کے حضرات کو کوئی حق نہیں کہ وہ محبت کے پاس بھی پھٹکیں کیونکہ اس طرح ہمارے جذبات کا خون ہو جاتا ہے۔

سینما دیکھتے وقت محبت کے متعلق ہمارے خیالات بڑے لطیف ہوتے ہیں، ذرا سی ناگوار بات سے ہمیں صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے، اور اگر ہم ایک بھاری بھرکم گینڈے کو ہیرو کے روپ میں دیکھیں جو ایک موٹی تازی ہیروئن سے عشق کا دعویٰ رکھتا ہو تو ذرا اندازہ لگایئے کیا حال ہوگا ہمارا!

ہیرو صاحب ہیروئن کے کمرے میں کھڑے بڑی سنجیدگی سے کہہ رہے ہیں: "ہمیں دُنیا کی کوئی طاقت جُدا نہیں کر سکتی، ہم سماج کو کچل دیں گے، دنیا اگر ہم پر ہنستی ہے تو بیشک ہنسے، ہم یہ کر دیں گے، وہ کر دیں گے" اور ساتھ ساتھ وہ اپنی نوخیز توند پر ہاتھ پھیرتے جاتے ہیں، تو اس وقت ہم سوچتے ہیں کہ یہ سراسر جھوٹ بول رہے ہیں اور اُن کے دماغ میں سامنے رکھے ہوئے پھلوں کی خوشبو بسی ہوئی ہے جن پر یہ اپنی پہلی فرصت میں طبع آزمائی کریں گے۔

عجیب سی بات ہے کہ لوگ موٹے تازے آدمیوں کو محبت سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں وہ یہ تصور میں لا ہی نہیں سکتے کہ ایک انسان جس کا وزن دو من سے زیادہ ہو، جس کی دو ٹھوڑیاں ہوں جس کی توند طلوع ہو رہی ہو، اُس کے موٹے تازے دل میں بھی محبت کا جذبہ سما سکتا ہے عموماً یہی سوچا جاتا ہے کہ اس سائز اور اس

نمبر کے آدمی ہمیشہ کھانے پینے کی چیزوں کے متعلق سوچتے رہتے ہیں، اسی طرح تپ دق کے مارے ہوئے ہیرو بھی دوائیوں کے متعلق سوچتے رہتے ہیں۔ اسی زد میں خواتین بھی آسکتی ہیں۔ چنانچہ ایک فربہ خاتون کو سریلی آواز میں دردناک گانا گاتے دیکھ کر بجائے رونے کے ہنسی آتی ہے، اور دل میں یہی خیال آتا ہے کہ اب یہ گانا گاکر فوراً ایک بھاری سا ناشتہ تناول فرمائیں گی اور چند ڈکاریں لینے کے بعد مزے سے سوجائیں گی، علی الصبح آن کے میز پر دودھ کے دو لمبے لمبے گلاس بھرے رکھے ہوں گے۔

بعض اَوقات ہمارے دل میں باغیانہ خیالات کی گھڑ دوڑ ہونے لگتی ہے، ہم سوچنے لگتے ہیں کہ آخر کیوں ہمیں خوبصورت جسم والے ایکٹر نہیں دکھائے جاتے، واجبی صحت والی ہیروئن، اور پیارے بچے، یہ سب کہاں ہیں؟ کیا ہماری قسمت میں یہی لکھا ہے کہ بے تکے ہیرو، گلگلے جیسی ہیروئن اور کالے کلوٹے بسورتے ہوئے بچے دیکھیں اگر یہی ہے تو ہمیں اپنی قسمت سے ہمدردی ہے۔

. . . .

اَب رہ گیا فلموں کی لڑائی کے متعلق میں نے شاید پہلے بھی عرض کیا تھا، (اگر میں بھول گیا ہوں تو اَب سن لیجئے) کہ میں ڈنڈے مار فلموں کا ذکر نہیں کر رہا، بہترین ہندوستانی فلموں کے متعلق لکھ رہا ہوں۔ سو ایک بات کبھی سمجھ میں نہ آئی وہ یہ کہ ہمارے ہیرو ولین کو بعض ڈھکیل ہی کیوں دیتے ہیں، مکہ یا تھپڑ وغیرہ کیوں نہیں مارتے اگر انھیں ولین کے جذبات کا بہت خیال رہتا ہے تو ڈھکیلنا بھی فضول سی بات لگتی ہے۔ کچھ بھی نہ کہا کریں۔ دیکھئے نا ایک بڑا دہشتناک سین ہے، ایک طرف ہیروئن بھیگی بلی بنی کھڑی ہے، اس کے ساتھ ولین کھڑا اُسے دھمکا رہا ہے ہیرو آجاتا ہے (وہ عموماً مصیبت کے وقت آجایا کرتا ہے، اس کی عادت ہے) یہ دیکھتے ہی اُس کی حالت غیر ہو جاتی ہے، نتھنے پھول جاتے ہیں، ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے ہیں۔ لوگ مشتاق ہو جاتے ہیں کہ دیکھئے اَب ولین کا کیا حال ہوگا لیکن جب وہ دیکھتے ہیں کہ ہیرو آگے بڑھ کر ولین کو ایک طرف ڈھکیل دیتا ہے تو اُن کی تمام اُمنگوں پر پانی پھر جاتا ہے۔

اُدھر ولین اِس صدمے سے اس قدر نڈھال ہوجاتا ہے کہ وہ اُٹھ نہیں سکتا، نہ وہ ہیرو سے لڑنے کی جرأت کرسکتا ہے، بس وہیں چپ چاپ لیٹا رہتا ہے، یا چپکے سے باہر چلا جاتا ہے۔ اور اگر لڑائی ہوتی بھی ہے تو یوں کہ اِدھر سے ہیرو جو ڈھکیلنا شروع کرتا ہے تو ولین کو دوسری دیوار تک لے جاتا ہے، پھر اُس کی باری آتی ہے اور وہ دھکیلتا دھکیلتا ہیرو کو اِدھر لے آتا ہے، اِسی طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے، اور نتیجہ وہی نکلتا ہے جس کے سب منتظر ہوتے ہیں۔

بعض اوقات ایک اور قسم کی لڑائی دیکھنے میں آتی ہے، ایک جگہ بہت سے آدمی کھڑے ہیں۔ یکایک سب کے سب پستول نکال لیتے ہیں، ہیرو ولین کو نشانہ بناتا ہے۔ ولین فوراً ہیرو کی طرف پستول کا رُخ کر دیتا ہے، وہ گھوڑا تو دباتا ہے لیکن گولی ہیرو کے برابر سے نکل جاتی ہے بعد ایک اور شخص خواہ مخواہ مر جاتا ہے، ولین گرتے گرتے ہیروئن کے چچا زاد بھائی کو مار ڈالتا ہے اور وہ کسی اور کو، ہیروئن بھی کئی حضرات کو ہلاک کر دیتی ہے، اس کے بعد جو دھما دھم ہوتی ہے تو چاروں طرف دھواں ہی دھواں چھا جاتا ہے اور جب دھواں صاف ہوتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ صرف ہیرو اور ہیروئن زندہ کھڑے ہیں باقی سب لوگ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

. . . .

ڈاکٹر، وکیل، اور تھانے دار یہ سب ہماری فلموں کی جان ہیں، جس فلم میں ایک آپریشن، ایک عدالت کا سین اور ایک گرفتاری عمل میں لائی نہیں جاتی اُسے بہت کم لوگ پسند کرتے ہیں۔

لیکن فلموں کا ڈاکٹر آل راؤنڈر ہوتا ہے، یعنی

ہاتھ میں نشتر، گلے میں ربڑ کی نلکی، سر پر ہیڈ مرر (　　　)
بعد دیوار پر بینائی ٹسٹ کرنے کے حروف۔ اب بتائیے یہ سب
چیزیں ایک ہی شخص ایک ہی کمرے میں کیونکر کر سکتا ہے۔
خیر صاحب ہماری قسمت۔

ایک خطرے سے ہم آگاہ کئے دیتے ہیں اگر فلم میں کوئی
ایسا سین آجائے جہاں فضا میں سکون ہو، دو پرندے
(ہمارے پرانے دوست) بیٹھے ہوں، سورج نکل رہا ہو
یا ڈوب رہا ہو، بعد ہوا چل رہی ہو تو سمجھ لیجئے کہ ضرور
کوئی نہ کوئی گا دے گا۔ کسی نہ کسی ایکٹر کو بیٹھے بٹھائے
دورہ اٹھے گا اور دیکھتے دیکھتے وہ آپے سے باہر ہو جائے گا
اس وقت دنیا کی کوئی طاقت اسے گانے سے باز نہیں
رکھ سکتی۔

اور کچھ نہیں تو فوراً وہی ہمارا دیرینہ رفیق "ایک
سادھو" گاتا ہوا سامنے سے نکل جائے گا اور یہ لاٹری کی
علت بھی سچ مچ ہماری سمجھ میں نہیں آئی، فلم میں جہاں
کہیں ہیرو لاٹری کا ٹکٹ لے لے بس فوراً سمجھ لیجئے کہ یہ
صاحب تین چار لاکھ روپے وصول کریں گے، یہ یک طرفہ
کارروائی ہمیں بالکل پسند نہیں۔

یا تو یوں ہو کہ فلم کے تمام ایکٹروں کو لاٹری کے ٹکٹ
خریدتے دکھایا جائے اور پھر کسی ایک کے نام انعام نکل
آئے۔ یہ تو کوئی بات بھی نہ ہوئی۔

لیکن صاحب جو سب سے غریب ہوتا ہے اسے کوئی
مجبور کر کے ایک ٹکٹ دلوا دیتا ہے، بعد پھر یکلخت وہ آوارہ
ہو جاتا ہے اور بیوی بچوں کو چھوڑ چھاڑ کر بمبئی بھاگ جاتا ہے
اور سارا روپیہ خرچ کر کے اندھا یا کانا ہو کر واپس آجاتا ہے
آتے ہی اس کی بیوی فوراً اسے معاف کر دیتی ہے، اور
ایک ڈاکٹر اوپریشن کر کے اس کی آنکھیں درست کر دیتا ہے
اور جہاں سے یہ قصہ شروع ہوا تھا وہیں ختم ہو جاتا ہے۔

اور زمینداروں کے متعلق لگاتار فلمیں دیکھ دیکھ کر ہمیں
یقین ہو گیا ہے کہ زمیندار ایک نہایت رومانی ہستی ہے،
جس کا کام صبح سے لے کر شام تک شعر و شاعری یا محبت کرنا ہے
کپاس کے کھیتوں میں عشق کی گھاتیں ہوتی ہیں، چرواہے
بیلوں اور بھینسوں میں بیٹھ کر محبوب کی یاد میں بانسری
بجاتے ہیں، ہر ہل چلانے والا ایک زبردست گویا ہوتا ہے
جو چوبیس گھنٹے گاتا ہی رہتا ہے۔

ہر زمیندار کے لڑکے کا فرض ہے کہ وہ ضرور کسی سے
محبت کرے، اور زمیندار کا فرض ہے کہ پہلے تو وہ تفریحاً
ناراضگی ظاہر کرے اور پھر شادی پر رضامند ہو جائے۔

لیکن ہمارے ایک زمیندار دوست نے جب
ہمیں مدعو کیا، اور ہم ایک عرصے تک ان کی حرکات و سکنات
کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد بھی کوئی مشکوک بات برآمد نہ
کر سکے، تو ہماری امیدوں کا خون ہو گیا۔

. . . .

ہیروئن کی شادی ہو رہی ہے لیکن غلط آدمی
کے ساتھ، ہیرو یا تو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا ہے
یا کہیں دوسری جگہ ہے لوگ بے چین ہو رہے ہیں، ولین
بڑا خوش ہے۔ ہیروئن رو رہی ہے (بعض اوقات ایسے
موقعوں پر ہیروئن گانے سے بھی نہیں چوکتی) پھر شادی
کی اصلی رسم شروع ہوتی ہے۔ یکلخت ایک آدمی دوڑتا ہوا
آتا ہے اور چلا کر کہتا ہے ——"ٹھیرو!"

اس کے پیچھے پیچھے پولیس کا ایک افسر اور چند
سپاہی ہیں جو فوراً ولین کو گرفتار کر لیتے ہیں، وہ کہتا ہے
میں بے قصور ہوں، جواب ملتا ہے کہ یہ عدالت میں کہنا،
ہمیں تمہاری شادی کا ستیاناس کرنا تھا سو کر ہی دیا!

عموماً ہیرو پولیس کے ساتھ آیا کرتا ہے لیکن بعض
اوقات ادھر ادھر سے بھی برآمد ہو جاتا ہے، ہیروئن کے
ابا اسے اشارہ کر دیتے ہیں کہ جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر
آجاؤ۔

ادھر جو براتی ولین کے ساتھ آئے تھے وہ سوچتے
ہیں کہ چلو شادی ہی میں جانا تھا نا، خواہ کسی کی ہو۔ بس وہ

وہیں بیٹھے رہتے ہیں۔

پھر رومن وقتوں کا سین دکھایا جاتا ہے، چند لوگوں نے رومن لباس پہن رکھا ہے، باقیوں نے نیکریں اور پتلونیں پہن رکھی ہیں، چند حضرات چھتریاں لگائے پھر رہے ہیں۔ ایک دروازے میں سے کچھ اونٹ چلے جا رہے ہیں، ایک صاحب کے بال انگریزی تراش کے ہیں ذرا غور کرنے پر کسی بازار میں بجلی کا کھمبا، کسی مکان پر کبوتروں کی چھتری، اور کسی درخت کی آڑ میں مسجد کا مینار ضرور مل جائے گا۔ یا یوں کہ ۱۹۰۱ء کا واقعہ دکھایا جا رہا ہے اور دیوار پر کیلنڈر لگا ہوا ہے ۱۹۴۲ء کا۔

اگر کوئی ایکٹر کسی ایکٹر سے کوئی راز کی اصلیت پوچھنا چاہے کہ "جلدی بتا دو" وہ بات کیا ہے؟ (یا کیا تھی؟) اور دوسرا ایکٹر کہے "ذرا ٹھہرو ابھی بتاتا ہوں"—— یا "ذرا سے انتظار کے بعد سب کچھ معلوم ہو جائے گا" تو سمجھ لیجئے کہ اس ایکٹر کا مطلب ہے کہ "بھیا ابھی جلدی کیا ہے ذرا دو تین ریل (   ) اور گذر جانے دے" پھر بتائیں گے، اگر جلدی جلدی باتیں بتائی گئیں تو فلم چھوٹی سی رہ جائے گی۔ ابھی ایک دو گانے ہوں گے، ایک آدھ ریل کا یا عدالت کا سین آجائے، پھر بتا دیں گے۔"

. . . .

اب آخر میں ہم چند پُراسرار باتوں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو ہمارے لئے معموں سے کم نہیں، ہم چاہیں جتنا سوچیں لیکن ان گتھیوں کو نہیں سلجھا سکتے۔ مثلاً جب ہیرو ایک برس تک جنگل میں رہتا ہے، جہاں اس کے کپڑے پھٹ جاتے ہیں کھانے کے لئے بندروں سے دھینگا مشتی کر کے پھل مہیا کرتا ہے تب ہر روز علی الصبح اس کی حجامت کون کر جاتا ہے، جب وہ صبح صبح اٹھکر تیرتا ہے تو اس کا چہرہ آئینے کی طرح صاف ہوتا ہے۔

اور پھر یہ کہ جب کبھی پندرہ یا سولہ برس گزرتے دکھائے جاتے ہیں، ایک دھندسی پردے پر آجاتی ہے، سین بدلنے پر ہم دیکھتے ہیں کہ اتنے طویل عرصے نے کسی ایکٹر کی صحت پر ذرا سا بھی اثر نہیں کیا، ہیرو پہلے سے زیادہ چست ہے، ہیروئن پہلے سے کہیں خوبصورت اور چاق و چوبند ہے، اُن کے والدین بھی ہو بہو ویسے ہی ہیں بلکہ پہلے سے کچھ تندرست ہیں۔ یہ سین دیکھ کر ہم سوچتے رہتے ہیں کہ اُن لوگوں نے پندرہ سال تک وہ کون سا ٹانک (طاقت کی دوا) استعمال کیا ہوگا۔ کاش کہ ایسے وقت اُس ٹانک کا نام بھی بتا دیا جائے۔

اور جب کردار خودکشی کرنے جاتے ہیں تو چُپ چاپ کیوں نہیں جاتے، گاتے ہوئے کیوں جاتے ہیں۔

اور ایک خاتون جو آٹھ دس برس سے ہیرو پر فریفتہ ہیں، یکلخت کسی اور خاتون کو ہیرو کے ساتھ پھرتے دیکھکر اپنے حقوق کیوں بخش دیتی ہیں؟ —— اور ساتھ ہی یہ کیوں فرمادی ہیں کہ آج سے ہیرو اُن کا بھائی ہے۔ اسی طرح ہیرو بعض اوقات اچھی بھلی محبوبہ کو بہن کیوں بنا ڈالتا ہے؟

. . . .

آخر میں ہم پھر عرض کئے دیتے ہیں کہ ہم ہندوستانی فلموں کو اس حسرت انگیز ترقی پر بڑے مسرور ہیں، ہمیں اس بات پر فخر ہے، بعض اوقات ہم مغرور بھی ہو جاتے ہیں اور دیر تک مغرور رہتے ہیں۔

اور یہ جو بعض اوقات ہمارے دل میں عجیب سے خیالات آنے لگتے ہیں یہ عارضی ہوتے ہیں کچھ دیر کے بعد بخارات بن کر اڑ جاتے ہیں۔ اور ہم پھر اپنی فلموں کے دلکش تصور میں کھو جاتے ہیں۔

. . . .

جناب ایڈیٹر صاحب روزنامہ
مشیر دکن (حیدرآباد)

اِدارۂ اِشاعت اُردو حیدرآباد

ٹھیک ایک سال قبل اُردو کی اشاعت و ترقی کی غرض سے **مالکان اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد** کی جانب سے اِس ادارہ کی بنیاد رکھی گئی۔ اور اس کے ضبط و انتظام کے لئے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا گیا جو قدرت کی طرف سے اس کام کا بے مثل دماغ لے کر آیا ہے۔ اور جو کتابوں کے انتخاب اور ان کی نفیس و جمیل صورت میں اشاعت کا اِس قدر ماہرانہ تجربہ اور قابلیت رکھتا ہے کہ کم از کم حیدرآباد میں تو اس کا جواب نہیں ہے۔ ہمارا مطلب **جناب چودہری اِقبال سلیم گاہندری** سے ہے۔

اگرچہ حیدرآباد میں اس وقت کئی ادارے اُردو ادب کی ترقی و اشاعت میں سرگرم عمل ہیں لیکن یہ نوعمر ادارہ اس کے کارکنوں کی کوششوں اور ترقی اردو کے حقیقی اِحساس کی بدولت ان سب سے آگے بڑھ گیا ہے۔ حیدرآباد کے لحاظ سے ایک سال کی مدت کتابوں کی طبع و اشاعت کے لئے بہت قلیل سمجھی جاتی ہے۔ لیکن یہ معلوم کرکے حیرت ہوتی ہے کہ اِدارہ اشاعت اُردو نے معلوم ہوتا ہے کہ جسکی سنگ بنیا نیک ساعت میں رکھی گئی ہے، اِس قلیل مدت میں ملک کے بلند پایہ ادیبوں کی بیس سے زیادہ علمی و اَدبی معیاری کتابیں نہایت حسین و جمیل صورت میں شایع کی ہیں۔ ان کتابوں کی اشاعت میں مفید موضوعات کے علاوہ اردو زبان کی وسعت و پاکیزگی کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ اِدارہ کی مطبوعات کو ملک اور بیرون ملک میں بڑی قدر و عزت کے ساتھ دیکھا جا رہا ہے۔

ادارۂ اِشاعت اُردو نے اپنے مقصد کے مشن ُنت میں ایک بہترین علمی و ادبی ماہوار رسالہ "**پیام ادب**" کے نام سے شایع کیا ہے جسکے دو نمبر بڑی آب و تاب کے ساتھ نکل چکے ہیں۔ اس رسالہ کے **مینجنگ ڈایرکٹر** بھی جناب **اقبال سلیم** صاحب ہی ہیں۔ حیدرآباد سے اِس قدر نفیس کتابت و طباعت کے ساتھ بہت کم رسالے نکلے ہیں۔ پرچہ کی تازہ اِشاعت اکٹوبر ۱۹۴۳ء میں مضامین بہت ہی دلچسپ اور معلومات آفریں ہیں۔ افسانے بھی بہت دلچسپ اور حصہ نظم بھی بہت دلکش رسالہ اس قدر باریک اور خوشنما لکھا گیا ہے کہ سو صفحوں کا مضمون پچاس صفحات میں آگیا ہے رسالہ کی قیمت چھ روپیہ سالانہ۔ اور فی پرچہ ۸ رہے۔

اِس وقت ادارہ کی دو تازہ مطبوعات **زندگی کے نئے زاوئیے** اور **رنگ محل** ہمارے پیش نظر ہیں "زندگی کے نئے زاوئیے" رئیس احمد صاحب جعفری کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جعفری صاحب وہی ہیں جنہوں نے مولانا محمد علی مرحوم کی مشہور سیرت لکھی ہے۔ اب آپ افسانہ نگار کی حیثیت سے پیش ہوئے ہیں۔ آپ نے اپنے افسانوں کی بنیاد نہایت دلنشین اور موثر واقعات پر رکھی ہے۔ آپ کا تخیل بہت دلپذیر ہے۔ ان افسانوں میں حقیقی معنوں میں زندگی کے نئے زاوئیے پیش کئے گئے ہیں تمام افسانے دلچسپ اور پر لطف ہیں۔ کل ۱۶ افسانے ہیں صفحات ۲۶۶ کتابت و طباعت نفیس، مجلد خوشنما گرد پوش، قیمت تین روپئے۔ دوسری کتاب **رنگ محل** ہے یہ ہندستان کے مشہور و معروف شاعر ساغر نظامی کی رومانی نظموں گیتوں اور غزلوں کا نیا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب بھی (۲۰۸) صفحات پر بہت خوشنما چھپی ہے۔ مجلد دیدہ زیب گرد پوش قیمت دو روپیے آٹھ آنہ کلدار ہے۔

منقول از اخبار مشیر دکن مورخہ ۱۹؍ اکتوبر ۱۹۴۳ء

جاوید لطیفی

ایک اسٹڈی

سیدھی لکیر

منٹو کا افسانہ "ٹیڑھی لکیر" دیکھ کر

وہ بیچارہ ایک کلرک ہی تو تھا۔ اُس کی زندگی میں کونسی دلکشی ممکن تھی — ؟ رات کی بھیانک تاریکی میں جب کہ موسلا دھار بارش ہو رہی ہو، اپنا گھوڑا برق رفتاری سے دوڑائے چلے جانے والا وہ ایک نڈر شہزادہ تو تھا ہی نہیں۔ وہ کسی حسین دوشیزہ کو ناگہانی آفت سے رہائی دلانے والا منچلا افسانہ نگار بھی نہیں تھا۔

آخر وہ کیا تھا — ؟ زندگی کی شاہراہ پر ناک کی سیدھ میں چلنے والا ایک سیدھا سا دفتر کا منشی۔

وہ دُنیا میں اکیلا تھا — ایک غیر آباد گلی کے کونے میں "برہمن چال" کی زیریں منزل کے ایک تاریک کمرے میں اُس نے اپنا سامانِ زندگی سجایا ہوا تھا۔ کمرے کے وسط میں بارہ آنہ کی ایک چٹائی جس میں کئی سوراخ تھے بچھی ہوئی تھی۔ اس پہ ایک پرانی گدی جس کی روئی باہر جھانک رہی تھی بیٹی پڑی تھی — گدی کی اس حالت کو ہم بیٹی ہوئی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ "جناب" صبح اُٹھتے ہی ایک ٹھوکر سے اُسے دیوار کی طرف دھکیل دیتے، اس وقت وہ ان کی ٹھوکر کھا کر جو بھی شکل اختیار کرے، وہی اس کی اصلی شکل ہوتی۔ رات میں دیوار کی طرف سے دوسری بے پناہ ٹھوکر کھا کر وہ چٹائی پر پھیل جاتی۔ گدی پر ایک پرانی دھوتی چادر کے طور پر استعمال ہوتی اور ایک شکستہ ڈکشنری تکیہ کی کمی کو پورا کرتی۔ چٹائی کے آس پاس بیڑیوں کے ٹکڑے اور بجھی ہوئی دیاسلائیاں پھیلی ہوتیں، کونے میں ٹین کا ایک ٹرنک کھلا پڑا رہتا، کھونٹی سے ان کا اکلوتا کوٹ لٹکتا رہتا جس پہ ان کی میلی ٹوپی رکھی ہوئی رہتی۔ سامنے دیوار پر ایک پرانی وضع کا چراغ روشنی پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف نظر آتا۔ ایک کونے میں ایک بالٹی اور کبھی نہ صاف کیا ہوا ایک میلا لوٹا، اور دوسرے کونے میں ایک ٹین کا ڈبا اور پھٹے ہوئے دکھتی جوتوں کا ایک جوڑا رہتا۔

محرر صاحب بیس[20] سال کے طویل عرصے سے اِن چیزوں سے فائدہ اُٹھا رہے تھے۔ اِن بیس سالوں میں اُن کے کمرے سے کسی نے نہ تو اُن کی رفیقہ حیات کی چوڑیوں کی جھنکار سُنی اور نہ ہی کسی بچے کے رونے ہنسنے کی آواز۔ اِس بیس سال کے عرصے میں کسی پڑوسی نے ان کے دروازے میں قدم نہیں رکھا تھا۔ کبھی کبھار "چال" کے شریر لڑکے کھیلتے کودتے اُن کے کمرے تک آجاتے لیکن کمرے کے پاس آتے ہی وہ خاموشی سے گردن جھکائے وہاں سے نکل جاتے۔ منشی جی جونہی "چال" میں قدم رکھتے نل پر چیخ و پکار کرنے والی عورتیں خاموش ہوجاتیں اور ایک دوسرے کا منہ تکنے لگتیں۔

مگر منشی جی اُن سہمے ہوئے شریر بچوں کی طرف

یا اُن سراسیمہ عورتوں کی طرف گردن پھیر کر بھی نہ دیکھتے۔ منشی جی اپنے کمرے میں اس طرح آتے جاتے جیسے کوئی بلی کسی کمرے میں حسب معمول آتی جاتی ہو۔

ان کا روزانہ کا پروگرام بالکل مخصوص اور معین تھا صبح اٹھکر حسب معمول نل کے نیچے نہا کر فارغ ہوتے ہی ٹھیک سات بجے وہ سامنے والے ایرانی کے ہوٹل میں جا پہنچتے ہمیشہ کی مانند ایک مخصوص کونے میں چھتری رکھ کر وہ کرسی پر بیٹھ جاتے۔ اگر کرسی کا رُخ دیوار کی طرف نہ ہوتا تو وہ اس کا منہ ادھر پھیر لیتے۔ منشی جی نے آج تک ایک پیالی کے سوا کبھی دوسری پیالی نہیں منگائی تھی۔ ٹھیک ساڑھے نو بجے وہ طعام خانے پہنچ جاتے اور اپنی مخصوص جگہ بیٹھ کر کھانے میں مصروف ہو جاتے اور کھانا ختم ہونے تک گردن نہیں اُٹھاتے اُنھوں نے آج تک وہی کا پیالہ یا حلوے کی پلیٹ کا آرڈر نہیں دیا۔

بمبئی میں منشی جی کا دفتر فورٹ کے کسی حصے میں تھا۔ اُن کے آفس جانے آنے کا راستہ مقررہ تھا۔ دھوبی تالاب کے ایک اندھے فقیر کو وہ بلا ناغہ ایک پیسہ دیتے۔ آفس میں وہ ہوتے اور ان کا کام۔ ناس کی چٹکی لینے کے لئے وہ کبھی اپنی کرسی سے اٹھکر باہر نہیں گئے۔ گیارہ سے پانچ بجے تک اُن کا قلم چر چر کرتا رہتا جس سے ترچھے حروف بنتے رہتے

آفس سے نکل کر وہ چوپاٹی کا رُخ کرتے اور اپنی مقررہ بنچ پر بیٹھ کے وہ قریب ہی بیٹھے ہوئے ایک "جوڑہ فروش" کی طرف دیکھتے رہتے۔ لیکن پشت ہمیشہ سمندر کی طرف کرکے بیٹھتے۔ ہاتھ میں ہر وقت سفید کپڑے کی چھتری موجود رہتی جس کا استعمال وہ چھڑی کی طرح کرتے۔ دھوپ اور بارش میں اُنھیں چھتری کھولنے کا خیال تک نہ آتا تھا۔ وہ نگاہیں جھکائے ہوئے چلتے چلے جاتے چلتے میں کبھی کبھی اُن کے ہونٹ تھرتھراتے اور کبھی کبھی اُن میں سے ایک آہ سرد بھی نکل جاتی۔ مگر اس کو سننے والا کون —؟

شام کو کھانے سے فارغ ہو کر وہ سیدھے کمرے پر پہنچ جاتے۔ مگر چراغ لگانے کی نوبت شاید ہی آتی۔ ایک ٹھوکر سے بستر پھیلا دیتے اور اس پر لیٹ کر گھنٹوں تاریکی میں چھت کی طرف دیکھتے رہتے۔

اسی طرح اور بیس سال گزر گئے۔ مگر منشی جی کے نظام زندگی میں کوئی نمایاں فرق نہ ہو سکا۔ جب ایرانی دیوالیہ ہو گیا۔ طعام خانہ اجڑ گیا۔ تب سے انھیں چیزوں نے ان کے نظام زندگی میں صرف یہ تبدیلی کر دی تھی کہ اُن کا طعام خانہ بدل گیا تھا۔

اب بھی وہی چالیس سال کا ٹین کا ڈبہ کونے میں پڑا تھا۔۔ اور منشی جی —— ؟ اسی کمرے میں رہتے تھے اسی دفتر میں کام کرتے تھے اسی راستے سے جاتے آتے بجائے بیل گاڑی کے وکٹو ریہ چلنے لگی ٹرام جاری ہو گئی سڑکوں پر موٹریں دوڑنے لگیں۔ مگر منشی جی پرانی لکیر کے فقیر تھے۔ اب ان کی جسمانی قوت جواب دے چکی تھی۔ وہ کھانسی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ رات بھر کھانستے رہتے۔ مگر اُنھوں نے کبھی کسی ڈاکٹر یا حکیم کی صورت نہیں دیکھی۔ پڑوسیوں سے کبھی مشورہ نہیں لیا۔ چلنے میں وہ لڑکھڑا جاتے۔ اب اُن کی وہ پہلی خوش خطی زائل ہو چکی۔ انگلیاں کانپتیں، غلطیاں ہوتیں۔ ہیڈ کلرک بگڑ کر کہتا ———

"منشی جی اب تمہارے دماغ کا توازن بگڑ چکا ہے یہ کیا خط ہے!۔ جاؤ پھر لکھو ۔ اور یہ حساب بھی تو غلط ہے بے وقوف کہیں کے ——

منشی جی اپنی ناک کی نوک پر رکھے ہوئے چشمے سے ہیڈ کلرک کی طرف اس طرح دیکھتے جیسے اُنھوں نے کچھ سُنا ہی نہیں، اور خاموشی سے کاغذات اٹھا کر اپنی جگہ بیٹھ جاتے۔

جسمانی اختلاط کے اس دور میں منشی جی یہ چاہتے تھے کہ چھوٹے چھوٹے بچے ان کے کمرے میں آئیں جائیں مگر وہ انھیں کس طرح بلائیں ——؟ اُن سے کیا باتیں کریں ——؟ انھیں کچھ سوجھتا نہ تھا۔ تاہم ایک آوارہ اور غلیظ لڑکا منشی جی کے کمرے میں دکھائی دینے لگا۔ منشی جی اس سے کچھ کہے سنے بغیر اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے اور اس کو چاکولیٹ کی دو ٹکیاں دیدیتے۔ ایک بوڑھی پڑوسن منشی جی کا کھانسی سے بُرا حال دیکھ کر ازراہ ہمدردی اُن کے کمرے میں آجاتی۔ منشی جی کا اگلا دان بھی کوئی نامعلوم ہستی صاف کرکے لا دیتی جس کا احساس انھیں تھا۔ مگر انھوں نے اس کے متعلق کبھی دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی۔

اِسی طرح دن گزرتے گئے۔ کھانسی بڑھتی گئی۔ راتیں وہ جاگ کر گزارنے لگے۔ تھوک تھوک کر انھوں نے سارا کمرہ غلیظ کردیا۔ اب وہ نل پر جاتے بھی تو دیوار کا سہارا لئے ہوئے۔ وہی غلیظ لڑکا انھیں چائے لا دیتا۔ بوڑھی پڑوسن خانگی دوائیں لا دیتی اور منشی جی خاموشی سے انھیں استعمال کرلیتے۔ آفس کا جانا آنا بند ہوچکا تھا۔ منشی جی کی کرسی پر نیا کلرک بیٹھ کر کام کرتا رہتا تھا۔

آخر وہ دن آہی گیا —— پڑوسیوں کو منشی جی کے کھانسنے کی آواز سنائی نہیں دی۔ جب بوڑھی پڑوسن دیکھنے کے لئے کمرے میں گئی تو کیا دیکھتی ہے کہ چالیس سالہ بوسیدہ گدی پر منشی جی کی لاش پڑی ہے۔ قریب ہی بالٹی، ڈبا اور ٹرنک اپنی جگہ موجود ہیں۔ اِن خاموش اور بے زبان دوستوں سے جنھوں نے آج تک اُن کا ساتھ دیا تھا۔ منشی جی رخصت ہوچکے تھے —— پڑوسن بڑھیا نے لوگوں کو خبر کردی۔ کفن دفن کی تیاریاں ہونے لگیں۔ پولس آئی —— تمام اسباب پر سرکاری قبضہ ہوگیا۔ جب منشی جی کی لاش گدی سے اٹھائی گئی تو ان کے سرہانے پڑی ڈکشنری پر ایک پولس مین کی نگاہ پڑی۔ جب اس کے ورق کھولے گئے تو ان میں سے ایک نوجوان اور حسین عورت کی تصویر نیچے گری جس سے ایک بھینی بھینی خوشبو نکل کر اس غلیظ کمرے کو معطر کرنے لگی۔

منشی جی کا جنازہ اُن کے آفس جانے والی سڑک سے گزرا۔ راستے پر ٹرام گاڑیاں، بسیں اور موٹریں دوڑ رہی تھیں۔ دکانیں کھلی تھیں، گوالے دودھ لئے جا رہے تھے "چال" میں عورتیں جھگڑ رہی تھیں بچے شور مچا رہے تھے اور منشی جی کی جگہ آیا ہوا نیا کلرک آفس جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔

اَدَب اور انقلاب

از ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری۔

اردو کے اَدَبی اِنقلاب کے سب سے بڑے علم بردار کے اُن مقالوں کا مجموعہ ہے جنھوں نے ہماری تنقید نگاری میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اِس مجموعہ میں وہ تاریخی مقالہ ادب اور زندگی بھی شامل ہے جس نے ادبی دنیا میں ہلچل مچادی تھی اور ترقی پسند تحریک کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس کے ساتھ بنگال کے باغی شاعر قاضی نذرالاسلام اور سوویٹ روس کے ادب پر وہ سیر حاصل مضامین جنھوں نے ہمارے شاعروں اور ادیبوں کے دماغ نگاہ کو وسعت بخشی۔ کتاب کے شروع میں ایک [illegible] ہر دو منشی پریم چند مرحوم، مولوی عبدالحق اور مصنف کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ قیمت ہے

ڈاکٹر غلام جیلانی برق

روحِ اقبال پر ایک معنی آفریں نگاہ

رُوحِ اقبال ۳۷۶ صفحات کی یہ کتاب ڈاکٹر یوسف حسین خان پروفیسر سیاسیات و تاریخ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کی تصنیف ہے۔ جو ادارۂ اشاعتِ اردو حیدر آباد نے ۱۹۴۲ء میں شائع کی۔

مصنف نے اس کتاب میں اقبال کے تصورِ حیات و کائنات کو تین شعبوں میں تقسیم کیا ہے۔ آرٹ، تمدن اور مذہب۔ آرٹ کے ضمن میں بتلایا ہے کہ ڈاکٹر ہیوگو کا مشہور مسئلہ "آرٹ برائے آرٹ" اقبال کے ہاں ناقابل قبول ہے۔ اقبال آرٹ کو زندگی کا خادم تصور کرتا ہے۔ اس کے نزدیک حقیقی آرٹسٹ یعنی شاعر وہی ہے جو زورِ یقین اور عشق کے فشار سے "القائی تصورات" کے اظہار پر مجبور ہو جائے۔ جو اپنی زبردست شخصیت سے "شعورِ اجتماعی" میں ایک ہیجان اٹھا دے اور اپنی "نوا" سے "ہمرہانِ سست عناصر" کو تیز خرام بنا دے۔

اقبال اسی خصوص کا ایک آرٹسٹ تھا جس کے آرٹ یعنی شاعری کا منتہا روحانی و اخلاقی انقلاب تھا۔ اس کے "آرٹ" کے محرکات دو تھے۔ اول یہ عقیدہ کہ "حیاتِ انسانی" کے "ارتقائی امکانات" لامحدود ہیں۔ دوم یہ احساس کہ کائنات میں نفسِ انسانی کو ہر قسم کی برتری حاصل ہے۔ اقبال کے عرفانی بربط سے جس قدر نوائیں نکلیں۔ خواہ وہ آتش بار تھیں یا سرور انگیز۔ وہ نفسِ انسانی کو ایسی بلندیوں کی طرف دعوت دیتی رہیں۔ جہاں "عقلِ خام کار" استوار بنتی ہے۔ اور فرزانگی، "جنون" کا روپ دھار لیتی ہے ؎

دیوانہ ہے دُنیا میں جو دیوانہ نہیں ہے
عاقل وہی ہوتا ہے جو عاقل نہیں ہوتا
(امیر مینائی)

اقبال کے آرٹ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے۔ کہ اُس کے ہاتھ سے زندگی کا دامن چھوٹنے نہیں پاتا۔ اُس کے ہاں حسن و صداقت ایک ہی حقیقت کے دو مختلف نام ہیں۔ اصلی آرٹ وہی ہے جو تمام "روحانی و اخلاقی اقدار" کا صحیح ادراک پیدا کرے اُس کے نزدیک حسن ایک آئینہ ہے۔ اور دل آئینہ حسن۔ حسن دامِ نظر سے بچ نکلنا چاہتا ہے۔ لیکن آرٹسٹ "تخلیقی عمل" کے کمند میں اسے پھانس لیتا ہے۔

یہ کائنات بظاہر بے ترتیب نظر آتی ہے۔ پہاڑوں کی بلند و پست چوٹیاں ستاروں کی بکھری ہوئی محفل۔ سطحِ دریا پر چھوٹی بڑی لہریں اور بہار و خزاں کے یہ منتشر مناظر بے ربط معلوم ہوتے ہیں۔ آرٹسٹ فطرت کے اس مہمل "طومار" میں ربط و وزن پیدا کرتا ہے۔ اس کی زندگی بیک وقت دو دنیاؤں میں بسر ہوتی ہے۔ ایک اس کے "من کی دُنیا" اور دوسری یہ کائنات۔ وہ کبھی تو اپنے تاثرات کا عکس آئینہ فطرت میں دیکھتا ہے۔ اور کبھی ساری کائنات سمٹ کر اس کے دل میں سما جاتی ہے۔ تاثراتِ لطیفہ کا یہی وہ مسلسل تموج ہے۔ جو شاعر کے اشعار میں امواجِ موسیقی بن کر تحلیل ہو جاتا ہے۔

آرٹسٹ اپنے سینے میں تخئیلی پیکروں کی ایک دنیا بساتا ہے۔ خونِ جگر سے ان کی پرورش کرتا ہے۔ اور پھر شبابی نغموں میں ڈھال کر انھیں یوں باہر لاتا ہے

کہ کائنات بیدار ہو جاتی ہے۔ اور روح کی پُر سکون گہرائیوں میں حقیقی زندگی یوں کروٹیں لینے لگتی ہے۔ جس طرح دہقانی دوشیزہ کے دل میں محبت کا اولین احساس۔

اقبال کے ہاں حقیقی شاعر کا ہر مصرعہ خونِ دل کا ایک قطرہ ہوتا ہے۔ اور اس کی رائے میں وہ نغمہ۔ نغمہ۔ ہی نہیں۔ جس کی پرورش "آغوشِ جنون" میں نہ ہوئی ہو۔

؎ نغمہ مے باید جنوں پروردہ
آتشے در خونِ دل حل کردہ

اگر کوئی آرٹسٹ حیاتِ انسانی کو فروغ و فراوانی نہیں دے سکتا۔ اپنی نوائے آتشیں سے "روحِ کائنات" کو برما نہیں سکتا۔ چمنِ افسردہ کو "پیامِ بہار" نہیں سنا سکتا اور حقائقِ حیات کے اُلجھے ہوئے تاروں کو سلجھا نہیں سکتا تو وہ ایک بے کار آرٹسٹ ہے۔ اور اس کا آرٹ کسی مصرف کا نہیں۔ ؎

شاعر کی نوا ہو۔ کہ مُغنّی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

مصنف نے اِس مضمون میں اقبال کے آرٹ کا ہر پہلو سے تجزیہ کیا ہے۔ مثلاً رومانی آرٹ، تخیلی پیکر۔ منظر کشی۔ اثر آفرینی۔ محاکات۔ غزل گوئی وغیرہ۔ اور ثابت کیا ہے کہ اقبال نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا۔ اُسے حسن و کمال کے آخری نقاط تک پہنچا کے چھوڑا ہے۔

اِس کتاب کا دوسرا مضمون ہے۔ "اقبال کا فلسفہ تمدن"۔ انسانی تمدن کے مشکل مسائل میں ایک پیچیدہ مسئلہ یہ ہے کہ فرد اپنی انفرادیت کو قائم رکھے یا جماعت میں جذب ہو جائے۔ اقبال نے وجدانِ صحیح کی بدولت اِس مشکل کا حل پا لیا۔ اور اعلان کیا کہ جس طرح سمندر کی ہر لہر سمندر رہی ہے۔ اور لہر بھی اس طرح ایک فرد۔ فرد بھی ہے اور انجمن بھی ہے۔ جماعت کا فرض ہے کہ وہ انفرادی خودی کی پرورش کرے۔ اِس لئے کہ انسانی فطرت کا تقاضا۔ "ذوقِ یکتائی بھی ہے۔ اور شوقِ بزم آرائی بھی" ؎

برون ز انجمنے در میان انجمنے
بخلوتِ اندوے آن چنان کہ با ہمہ اند

اقبال نے خودی پر بہت زور دیا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ فرد اپنی تکمیل کے بعد ملت میں اس طرح جذب ہو جائے جس طرح بجلی کے قمقمے فضا میں۔ اِس اتحاد سے زندگی مسلسل حرکت بن جاتی ہے۔ اور سواحلِ زمان و مکان سے اُچھل کر بیکراں ہو جاتی ہے۔ ؎

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

خودی "وحدتِ وجدانی" یا شعور کا وہ روشن نقطہ ہے جس سے انسانی جذبات منور ہوتے ہیں۔ یہ فطرت کی غیر محدود اور منتشر قوتوں کی شیرازہ بندی کرتی ہے یہی وہ وحدت ہے۔ جو نظمِ زندگی کا مرکزی نقطہ قرار پاتی ہے۔ اور اس پیمانے سے حیاتِ انسانی کی وسعتیں ناپی جاتی ہیں۔

افلاطون نے حقائقِ حیات سے گریز کا درس دیا تھا لیکن اقبال کے ہاں خودی اس وقت تک محکم نہیں ہو سکتی جب تک حادثاتِ زندگی سے اُلجھا نہ جائے۔ گوشہ گیری تخلیقی قوتوں کو فنا کر دیتی ہے۔ اور انجمن آرائی اُنھیں اُجاگر کرتی ہے۔

خودی کے لئے (خواہ وہ اجتماعی ہو یا انفرادی) احتیاج سمِ قاتل ہے۔ احتیاج سے مراد ہر قسم کا احتیاج ہے۔ خواہ وہ سیاسی و اقتصادی ہو یا عمرانی و مجلسی۔

؎ آنچہ شیراں را کند روبہ مزاج
احتیاج است احتیاج است احتیاج

انسانِ کامل خودی کی پیداوار ہوتا ہے۔ اس میں جلالی و جمالی ہر دو قسم کی صفات پائی جاتی ہیں۔ یہ چمنستان محبت میں سے لاجوئی نواسنج بن کر گزرتا ہے۔ اور بیابانوں میں

"سیل تند رو" بن جاتا ہے۔ ؎

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

مصنف نے اس عنوان کے تحت مقاصد آفرینی۔ اخلاق وعمل۔ حیاتِ اجتماعی۔ مملکت و تمدن۔ نظام معیشت تاریخی استقرا اور فرد و جماعت پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔

تیسرا مضمون "اقبال کے مذہبی اور مابعد الطبیعی تصورات" پر ہے۔ اقبال کے تصورات میں سب سے قوی اور دور رس وہ افکار ہیں جن کا تعلق مذہب سے ہے گل شبنم سے پوچھتا ہے۔ کہ مرغانِ چمن کا ہنگامہ کس لئے ہے۔؟ خار کیوں ہیں؟ پایان نظر کیا چیز ہے؟ مقصود نوا اور مطلوب صبا کیا چیز ہے۔؟

گل گفت کہ ہنگامۂ مرغان سحر چیست
این انجمن آراستہ مالائے شجر چیست
این زیر و زبر چیست؟ پایان نظر چیست؟
خارِ گل تر چیست؟

اقبال طلسم کائنات کو سمجھنے کے لئے کائنات سے بہت دور اس حقیقت کبریٰ کی تلاش میں ہے جس کے بغیر اس کی اپنی ہستی وسعت گیتی میں بے معنی سی رہ جاتی ہے چلتے چلتے اسے انسانی عظمت کا خیال آجاتا ہے تو سوچتا ہے کہ میں خودی ہوں اور وہ خدا میں اسے ڈھونڈوں یا وہ مجھے — خود پسندی غالب آجاتی ہے تو پکار اٹھتا ہے۔ ؎

ما از خدائے گم شدہ ایم او بہ جستجو است
چوں ما نیاز مند و گرفتار آرزو است
گاہے بہ برگ لالہ نویسد پیام خویش
گاہے درونِ سینۂ مرغاں بہ ہا و ہو است

اس عنوان کے تحت مسئلہ تقدیر پر بھی بحث کی گئی ہے۔ اقبال کے ہاں تقدیر کے معنی ہیں معین کرنا یعنی اس دار مکافات میں اعمال کے نتائج معین اور اٹل ہیں۔ آگ میں ہاتھ ڈالنے کا نتیجہ جلنا اور بلندی سے گرنے کا نتیجہ چوٹ آنا ہے۔ یہ نتائج کسی قوم یا فرد کی خاطر بدل نہیں سکتے۔ اگر کوئی شخص تمام عمر کاہلی و بدعملی میں بسر کر دے۔ اور پھر خدا کو کوستا پھرے کہ اسے اعمال بد کی جزائے نیک کیوں نہیں ملی تو یہ اس کی کج فہمی اور غلط اندیشی ہے۔ ؎

معنیٔ تقدیر کم فہمیدۂ
نے خودی را نے خدا را دیدۂ
عزم تو خلاقِ تقدیر حق است
روز ہیجا تیر تو تیر حق است

ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے یہ کتاب فلسفیانہ انداز میں لکھی ہے۔ طرز نگارش مغلق اور پیچیدہ ہے مشکل نویسی کی عمداً کوشش کی گئی ہے مضامین و معانی کا تکرار کافی سے زیادہ ہے اور جا بجا ایسے جملے ملتے ہیں جو قلت الفاظ اور وفور معانی کی وجہ سے حل بن کر رہ گئے ہیں۔ ان خامیوں کے باوجود مضامین کے لحاظ سے کتاب اونچے درجے کی ہے۔ مصنف کا دماغ غضب کا خلاق ہے کہ مضمون در مضمون کی تخلیق کرتا چلا جاتا ہے۔ اقبال کی تمام تصانیف سے ہم مضمون اشعار کو ایک عنوان کے ماتحت جمع کر کے اس متانت سے سجایا ہے کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

ساغرؔ نظامی

غزل

ترے نام پر نو جوانی لٹادی | جوانی نہیں زندگانی لٹادی
یہاں عشرتِ زندگانی لٹادی | وہاں دولتِ جاودانی لٹادی
تقاضہ، تقاضہ، مقدر، مقدر | جوانی نے خود ہی جوانی لٹادی
یہ ہر کو بہارے یہ ہر سو نگارے | نگاہوں نے اپنی جوانی لٹادی
یہ اک روز مٹتی یہ اک روز لٹتی | یہ اک چیز تھی آنی جانی لٹادی
جوانی کے لٹنے کا غم ہو تو کیوں ہو | جوانی تھی فانی، جوانی لٹادی
خرد کو یہ ضد تھی نہ لٹتی یہ دولت | اسی ضد پہ ہم نے جوانی لٹادی
وہ گلیاں ابھی تک حسین و جواں ہیں | جہاں ہم نے اپنی جوانی لٹادی
محبت میں ہم اور کیا کچھ لٹاتے | متاعِ غرورِ جوانی لٹادی
جوانی نے بڑھ کر محبت کو لوٹا | محبت نے ہنس کر جوانی لٹادی
درِ خمستاں سے جوانی ملی تھی | درِ خمستاں پر جوانی لٹادی
جو مل جائے تو عمرِ رفتہ سے پوچھوں | یونہی لٹ گئی یا جوانی لٹادی
جو ساقی نے ہنس کر کبھی جام بخشا | تو ساغر نے اُٹھ کر جوانی لٹادی

نیا اُردو ادب

وہ کتابیں جن کے بغیر کوئی لائبریری مکمل نہیں کہی جاسکتی

اَدب اور اِنقلاب۔ از ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری۔

اُردو کے اَدبی اِنقلاب کے سب سے ممتاز علمبردار کے اُن مقالوں کا مجموعہ جنھوں نے ہماری تنقید نگاری میں ایک نئے باب کا اِضافہ کیا۔

اِس مجموعہ میں وہ تاریخی مقالہ "**اَدب اور زندگی**" شامل ہے جس نے ادبی دنیا میں ہلچل مچا دی تھی اور ترقی پسند تحریک کی بنا ڈالی تھی۔

اِس کے ساتھ **بنگال کے باغی شاعر۔ قاضی نذر الاسلام** اور **سوویٹ رُوس کے ادب** پر وہ سیر حاصل مضامین ہیں جنھوں نے ہمارے شاعروں اور اَدیبوں کے دل ونگاہ کو وسعت بخشی۔ کتاب کے شروع میں ایک اِعلان نامہ ہے جو **پنڈت جواہرلال نہرو**، **منشی پریم چند مرحوم**، **مولوی عبدالحق** اور مُصنف کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ قیمت تین روپیے آٹھ آنے مجلد۔ رنگین گرد پوش۔ کاغذ وطباعت اعلیٰ۔

ہندوستانی زبان کا پہلا مصوّر علمی شاہکار

کاروانِ علم۔ مُرتبہ **فیض محمد صدیقی و بادشاہ حسین**

(۱) اِس میں ہیئت ارضیات طبعی جغرافیہ اور حیات کے مسائل سے بحث کی گئی ہے۔

(۲) اِس میں سیاحوں، موجدوں، اِنشاپردازوں، فن کاروں اور سائنس دانوں کے سوانح حیات درج ہیں۔

(۳) اِس میں اُن تمام مسائل کے حل ہیں جو دن رات آپ کو اور آپ کے بچوں کو دعوتِ فکر دیتے رہتے ہیں۔

(۴) یہ دُنیا کے مختلف ممالک کے عروج و زوال کی داستان ہے۔

(۵) اِس میں اُن بہترین افسانوں کے نمونے ہیں جو مختلف ممالک کی خصوصیات کی نمایندگی کرتے ہیں۔

(۶) اِس میں حیاتِ انسانی کی تشریح کے بعد اُن مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے جو صحتِ عامہ پر اثرانداز ہیں۔

(۷) یہ اَدبیاتِ عالیہ کا بہترین نچوڑ ہے۔

(۸) یہ طبعی، کیمیائی، صنعتی اور تحقیقاتی مسائل کا معلم ہے۔

(۹) یہ نباتی اور حیوانی زندگی کا دلچسپ مرقع ہے۔

(۱۰) اِس میں ہر ملک کی موسیقی اور مصوّری کی تفصیلات درج ہیں۔

(۱۱) یہ ایسی عام معلومات سے پُر ہے جن کا علم ہر اچھے شہری کے لئے ضروری ہے۔

قیمت دو روپیے بارہ آنے مجلد۔ بہترین رنگین گرد پوش سائز ۲۰×۲۶/۱۶

مقالاتِ محمد علی۔ (حصہ اوّل)۔ محمد علی —

ہندوستان کا آتش نوا زعیم جب تک زندہ رہا۔ اپنی شعلہ سامانیوں سے محفل کو لذتِ سوز سے۔ لطفِ تپش سے، جلنے اور جلتے رہنے کے کیف سے روشناس کراتا رہا۔

اُس نے تقریریں بھی کیں، اور مضامین بھی لکھے۔ اُس کی زبان آبِ رواں کی طرح چلتی تھی۔ اُس کا قلم شمشیرِ خاراشگاف کا کام دیتا تھا۔

محمد علی مرحوم کے سوانح نگار **رئیس احمد جعفری** نے بڑی عرق ریزی اور دیدہ کادی سے یہ مجموعے مرتب کئے ہیں۔

پہلا اور دوسرا مجموعہ پریس میں جاچکا ہے۔ آج ہی اپنا نام درج رجسٹر کرالیجئے۔ ورنہ ممکن ہے آپ کو دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے۔

قیمت — تین روپیے بارہ آنے مجلد

لہریں۔ از ڈاکٹر شفیق الرحمان۔

شفیق الرحمان کے افسانے نوجوانوں کے افسانے ہیں۔ جو زندگی کو ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح متعفن اور بدرنگ نہیں بنانا چاہتے۔ اڑتے ہوئے لمحوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ محبت کرتے ہیں۔ کھیلتے ہیں۔ اور ان میں سے اکثر زندگی کے روشن پہلو کے ترجمان ہیں۔ وہ ہوس کارانہ محبت کے قائل نہیں۔ موجودہ تہذیب و تمدن کے سچے نمایندے ہیں۔ اور جوش عمل سے ان کی رگ رگ دھڑکتی معلوم ہوتی ہے۔

ضخامت تقریباً چار سو صفحات۔ مجلد۔
رنگین گردپوش۔ قیمت تین روپیے بارہ آنے

زندگی کے نئے زاویے۔ رئیس احمد جعفری۔

ہماری آپ کی نظر زندگی کے اس رخ پر پڑتی ہے جو آنکھ کے سامنے ہے۔ لیکن زندگی کا ایک اور رخ بھی ہوتا ہے۔ اس رخ کو اگر پیش نگاہ رکھئے تو کبھی کبھی بُرے اچھے، اور اچھے بُرے نظر آنے لگتے ہیں۔ ملمع اتر جائے تو اصل سامنے آجاتی ہے۔ پردہ ہٹ جائے تو حقیقت بے نقاب ہوجاتی ہے۔

زندگی کے نئے زاویوں کا افسانہ نگار آپ کے سامنے کچھ ایسی حقیقتیں رکھتا ہے جن کا ملمع اترا ہوا ہے۔ جن کا پردہ ہٹادیا گیا ہے۔ یہ وہ افسانے ہیں جو انسانی کردار، انسانی ذہنیت، انسانی نفسانیت اور انسانی سرشت کا نیا رخ پیش کرتے ہیں۔ یہ افسانے نہیں زندگی کی تصویریں ہیں۔ ہر افسانہ اپنی جگہ شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔

قیمت تین روپیے۔ مجلد۔ بہترین رنگین گردپوش۔

رُوحِ اقبال۔ از ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب فیرمعتمد ادارۂ عثمانیہ

اس کتاب میں جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے بڑی دقیقہ سنجی اور کاوش سے علامہ اقبال مرحوم کی شاعری اور فلسفہ کے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا ہے۔ نہایت دقیق مضامین کے بیان کرنے میں بھی انکلف زبان اور ادبیت کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ علامہ اقبال پر اس سے بہتر کوئی کتاب کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی۔

قیمت:۔ چار روپے چار آنے

جمہوریہ چین۔ از میر عابد علی خاں بی۔ اے (عثمانیہ)

گذشتہ نصف صدی میں چین کے سیاسی زوال نے مشرق بعید کی سیاست میں ایک بحران بپا کر رکھا ہے۔ ڈاکٹر سن یات سن نے اپنی انقلابی کوششوں سے چین کی کمزور مگر مطلق العنان شاہی سے نجات دلاکر جمہوریہ کی بنیاد رکھی۔ جمہوریہ چین جدید چین کا مکمل اور مبسوط تذکرہ ہے اور اردو ادب میں پہلی آواز ہے جو چین کی سیاسی، معاشی، اور معاشرتی زندگی کے متعلق بلند ہوئی ہے۔

قیمت:۔ ایک روپیہ بارہ آنہ مجلد

سیاستِ جاپان۔ از علی امام بلگرامی ایم۔ اے

سیاست جاپان سے متعلق ایک مختصر کتاب جس میں تاریخ کا تاریک دور۔ تجدید شہنشاہیت۔ انقلابی جنگ و دو۔ بیسویں صدی کا آغاز۔ نوکر شاہی کی حیلہ جوئیاں، جنگ عظیم کے بعد مزدوروں کی سرگرمیاں،

نیا سیاسی توازن، جاپان کا فسطائی ہونا۔ نیشنل سوشلسٹ لبرل ازم کا سنبھالا۔ وغیرہ موضوعات سے بحث کی گئی ہے۔

قیمت:۔ دس آنے۔

اقبال کا تصوّر زمان و مکان۔ از ڈاکٹر رضی الدین

ڈاکٹر صاحب کا تصورِ زمان و مکان پر بسیط اور مدلل مقالہ جس میں عوام کے تصوّر۔ اہلِ یونان کے تصور کی نوعیت ظاہر کرنے کے بعد علامہ اقبال کے اس تصوّر کو ظاہر کیا گیا ہے۔

قیمت:۔ بارہ آنے

اقبال کے خطوط جناح کے نام۔

اقبال مرحوم کے اُن خطوط کا مجموعہ جو انھوں نے قائد اعظم کے نام لکھے تھے۔ اور جن میں آج کل کے سیاسی مسائل کا ذکر ہے۔ یہ خطوط انگریزی سے ترجمہ ہیں

قیمت:۔ پانچ آنے

گرداب۔ از احمد ندیم قاسمی۔

گرداب میں ندیم اپنے آپ کو ایک نئے اور نرالے رنگ میں پیش کر رہا ہے۔ ان افسانوں میں اُس نے پربتوں اور میدانوں کی کھلی دنیا سے نکل کر موجودہ نیم شوریدہ تہذیب سے گونجتے ہوئے شہروں کی زندگی کا جائزہ لیا ہے۔ ندیم کی انفرادی خصوصیات اچھوتی فن کاری اور رسیلی زبان کی جھلکیاں آپ نے اس کی نظموں، قطعوں اور دیہاتی افسانوں میں دیکھی ہوں گی۔ اب ہندوستان کے اس جوان فکر ادیب کو نئے روپ میں دیکھئے۔

قیمت:۔ تین روپے بارہ آنہ مجلد۔ بہترین سہ رنگا گرد پوش

رنگ محل:۔ از حضرت ساغر نظامی

رنگ محل ساغر کی رومانی نظموں، غزلوں، اور گیتوں کا نیا مجموعہ ہے۔ شعر و حکمت کا مؤثر امتزاج۔ رومانیت و واقعیت کا دلنواز مرکب، انسانی ذہن و روح کے لئے فکر و نشاط کا جدید پیمانہ؛

قیمت:۔ دو روپے آٹھ آنے۔ مجلد رنگین گرد پوش

یقین و عمل۔ موجودہ دورِ انتشار و بے چینی کا حل۔

صدر جمعیتہ فلاسفہ لندن وائیکونٹ سموئیل کے قلم سے۔ حالیہ ادب میں یہ بہترین تصنیف اور عدیم النظیر کتاب ہے۔ تقریباً ساری ترقی یافتہ زبانوں میں اور سارے متمدن ممالک میں ہزارہا کی تعداد میں شائع ہو چکی ہے۔ اردو زبان میں پہلی بار یہ تحفہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ترجمہ معہ نوٹ از عبدالقدوس ہاشمی

قیمت۔ دو روپے چار آنے۔ مجلد رنگین گرد پوش

ٹیگور اور اُن کی شاعری۔ از مخدوم محی الدین ایم اے

ٹیگور کی شاعرانہ عظمت سے کون واقف نہیں اُن کی شاعری نے بین الاقوامی مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ یہ شاعرِ مشرق پر سب سے پہلی مستقل کتاب ہے، دوسرا ایڈیشن۔

قیمت:۔ ایک روپیہ آٹھ آنے

رئیس الاحرار محمد علی مرحوم۔ از مولانا عبدالماجد دریابادی

رئیس الاحرار مرحوم کی فطری اور ذہنی صلاحیتوں اُن کی علمی اور دماغی قابلیتوں، اُن کے جوشِ عمل، اُن کی ہمت بلند و عزم راسخ، اُن کی متواتر اور مسلسل عملی جد و جہد، اُن کے خلوص و ایثار، تواضع و انکسار، اُن کی آزادانہ تقریر، اُن کی بلندیٔ تحریر، اُن کے مؤثر و مدلل زورِ بیان کی تصویر ذاتی علم و تجربہ کی بنا پر

ہندوستان کے سحر نگار ادیب مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی نے کھینچی ہے۔ اور اس طرح کھینچی ہے کہ کوئی خدوخال چھوٹنے نہیں پایا۔ اس کے مطالعہ سے کسی ہندوستانی کو محروم نہیں رہنا چاہیئے۔
قیمت:۔ دو روپیے بارہ آنے

مضامین عبدالماجد دریا بادی۔

"مولنا دریا بادی کے ادبی تلاطم سے کون ناواقف ہے۔ اِن کی ہر تحریر ایک سیلاب کی طرح آتی ہے اور پڑھنے والا ایک قطرے کی طرح اس میں شامل ہو کر شریک سیلاب بن جاتا ہے۔ وہ اس سیلاب میں تھپیڑے کھاتا ہے۔ موجیں اس کو اُچھالتی ہیں، بھنور اس کو رقص کراتے ہیں۔ مدوجزر اس کو جلترنگ سُناتے ہیں۔ اور وہ اِن تمام کیفیات میں اس طرح گم ہو جاتا ہے۔ کہ نہ قطرہ بن کر فنا ہونا یاد رہتا ہے۔ نہ حباب بن کر اُٹھنے کا اسے ہوش رہتا ہے۔ یہاں تک کہ سیلاب گزر جاتا ہے اور وہ یکایک چونک کر اپنے کو محض ایک قطرہ پاتا ہے۔ سیلاب مزید کے لئے بیقرار۔ طغیانوں کا اُمیدوار۔" یہ شوکت تھانوی کی رائے ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر لیجئے۔
قیمت۔ تین روپے بارہ آنے

مُردوں کی مسیحائی۔ (مقالات سیرت کا مجموعہ)

حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی کے عشق و محبت نبی صلعم میں ڈوب کر لکھے ہوئے مقالات کا مجموعہ۔ اعلیٰ ترین کاغذ۔
قیمت:۔ تین روپیے چار آنے
مجلد۔ رنگین گردپوش

نغماتِ ماہر۔ از حضرت ماہر القادری۔

جوانی کی مُسکراہٹیں، دوشیزگی کی انگڑائیاں حُسن کے سدا بہار پھول، قوم و ملت کا دھڑکتا ہوا دل، آزادی کی مضطرب روح، زندگی کی تفسیر، پاکیزہ زبان، بلند افکار، اچھوتا تخیل، عدیم النظیر انداز بیان اور وہ سب کچھ جسے شعر و ادب کی روح کہہ سکتے ہیں۔
قیمت۔ تین روپیے۔ مجلد رنگین گردپوش

محسوساتِ ماہر۔ از حضرت ماہر القادری

جذبات کے شعلے، حُسن و جمال کے پھول، محبت کے نغمے اور کوثر میں دُھلی ہوئی زبان، تڑپتی ہوئی روحوں کے لیئے سامان تسکین، سوتے ہوؤں کے لئے تیر و نشتر کیف آور نظموں اور وجد آفریں غزلوں کا مجموعہ۔
(یہ دُوسرا ایڈیشن ہے)
قیمت:۔ تین روپیہ۔

اِدارۂ اِشاعتِ اردو عابد روڈ حیدرآباد دکن

هندوستان کے

مصنفین اور تاجران کتب اگر یہ چاہتے ہیں۔ کہ مملکت آصفیہ اور جنوبی ہند میں

ان کی کتابوں کی

زیادہ سے زیادہ فروختگی ہو تو ــــــ ادب کے پچاس سالہ تجارتی کتب خانہ

سید عبدالرزاق تاجر کتب عابد روڈ حیدرآباد (دکن)

(سے مراسلت کریں)

مملکت آصفیہ اسلامیہ اور جنوبی ہند

کی

قدیم و جدید کتابوں کیلئے

سید عبدالقادر اینڈ سنز تاجران کتب چارمینار حیدرآباد (دکن)

اور

سید عبدالرزاق تاجر کتب - عابد روڈ - حیدرآباد (دکن)